ہاتھی کے دانت

پہلی بار

مقام، نام اور ادارے
فرضی تصور کئے جائیں۔
مصنف اور ناشر پر
کسی قسم کی ذمہ داری
عاید نہیں ہوگی۔

قیمت:- تین روپے

ناشر چرنجیت لال
برائے
دیپک پبلشرز
جالندھر

ہاتھی کے دانت

طنزیہ اور مزاحیہ مضامین

ابناش چندر سُود

دیپک پبلشرز جالندھر

ناشر چرنجیت لال برائے
دیپک پبلشرز نے موہن
پریس جالندھر سے
چھپوایا۔

انتساب

اُن تمام ادب نوازوں کے نام ــــــــــ

جو کتابوں کو کرایہ پر لے کر، مانگ کر یا چُرا کر ادیبوں کی سرپرستی فرماتے ہیں!

ہاتھی کے دانت

فہرست مضامین

دیباچہ عرف پیش لفظ

دیباچہ لکھنے سے پہلے میں اسے بہت آسان کام سمجھتا تھا لیکن حال ہی میں مجھ پر یہ بھید کھلا ہے کہ یہ کام اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ سنجیونی بوٹی کو ڈھونڈنا! میں پورے یقین کے ساتھ یہ پیشینگوئی کر سکتا ہوں کہ جو شخص کسی کتاب کا دیباچہ نہیں لکھ سکتا وہ ایک کامیاب نائی۔ جولاہا یا مداری وغیرہ تو بن سکتا ہے لیکن ایک ادیب ہرگز نہیں۔ اب مجھ پر اُن ادیبوں کے ڈھول کا پول کھل گیا ہے جو ترقی پسندی یا اِسی قسم کے دوسرے خوبصورت بہانوں کی آڑ لے کر بغیر پیش لفظ کے ہی کتاب شایع کروا دیتے ہیں۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جتنا عرصہ مجھے اس کتاب کو لکھنے میں لگا ہے اس سے تقریباً ڈیوڑھا وقت اس کے دیباچہ کو لکھنے میں صرف ہوا ہے۔ اس دیباچہ کو لکھنے سے پیشتر میں نے دُنیا کی کم از کم اڑھائی ہزار بہترین کتابوں کے پیش لفظ پڑھے ہیں اُن میں سے چند ایک تو اتنے اچھے تھے کہ اگر ان کے فاضل مصنف باقی کتاب نہ بھی لکھتے تو آج تک ادبی دُنیا میں ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا۔ لیکن اُن میں کچھ اتنے

مہمل اور پھسپھسے تھے کہ ان کا مقابلہ بآسانی چھٹی یا ساتویں جماعت سے کسی طالب علم کے لکھے ہوئے جواب مضمون سے کیا جا سکتا تھا۔ بہر حال دیباچہ لکھنا ہے ایک دلچسپ چیز۔ میں اپنے طویل اور قیمتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ دیباچہ لکھنے کا کام خود کرتے ہیں تو پڑھنے والوں پہ بلا شرکت غیرے اپنی قابلیت کا سکہ جما سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ کہاوتوں (Quotations) کی کوئی کتاب اٹھا کر آٹھ دس مشہور مصنفین کے سنہری خیالات کا حوالہ اپنے دیباچہ میں ضرور دیجئے چاہے وہ موقعہ کے مطابق نہ بھی ہوں۔ کیونکہ دنیا میں عام طور پر وہی چیزیں بلند پایہ خیال کی جاتی ہیں۔ جنہیں عام لوگ نہ سمجھ سکیں۔ اس کے بعد اپنی ترتیب کے مطابق کچھ مشہور عالم کتابوں اور ادیبوں کا ذکر بھی کر دیجئے۔ ان کی کتابوں سے کچھ اقتباسات بھی چند سطروں میں ٹھونس دیجئے بس لیجئے دیباچہ حاضر ہے۔ عام لوگ خصوصاً اور خاص لوگ عموماً آپ کی قابلیت کے قائل ہو جائیں گے۔ اگر آپ خود کو دیباچہ لکھنے کے نا قابل سمجھ کر یہ کام اپنے کسی دوست یا ہم پیشہ سے کروا لیتے ہیں تو معاملہ اور بھی آسان ہو جاتا ہے وہ آئین یا ضابطہ فوجداری کی کسی بھی دفعہ کی زد میں آئے بغیر آپ کی تعریفوں کے پل باندھ سکتا ہے۔ اور یہ پل اتنے شاندار ہو سکتے ہیں کہ اگر ہوڑہ برج اور دنیا کے دوسرے مشہور پل آپ کی تعریفوں کے ان عظیم الشان پلوں کو دیکھیں تو مارے شرم کے ان کا دل چلو بھر پانی میں ترنیں البتہ نیچے بہتے ہوئے تعاون پانی میں گر کر ڈوبنے کو ضرور چاہنے لگا۔

مروجہ چال کے مطابق تو مجھے بھی طنز و مزاح کے ارتقا اور چند ایک مشہور طنز نگاروں اور مزاح نویسوں کے ارشادات عالیہ پر سیر حاصل تبصرہ

کرنا چاہیے تھا۔ اس کے بعد آپ کو مزید مرعوب کرنے کے لئے بھاری بھر
کم الفاظ میں اسی موضوع پر اپنے ذاتی خیالات اور لیاقت کا مظاہرہ کرتے
ہوئے ایک لمبا چوڑا مضمون بعنوان "طنز و مزاح ... میری نظر میں" وغیرہ
لکھنا چاہیے تھا لیکن میں یہ سب کچھ نہیں کروں گا کیونکہ مجھے چند ایک خفیہ
ذرائع سے معلوم ہو گیا ہے کہ آج کل کے قارئین پچھلے وقتوں کے قارئین
کی نسبت زیادہ سمجھدار ہو گئے ہیں۔ وہ اتنے کند ذہن نہیں ہیں
کہ کھرے اور کھوٹے کی پہچان نہ کر سکیں۔ اس لئے میں اس کتاب کی پرکھ کی
ذمہ داری کا بوجھ پوری شدت سے آپ کے مضبوط کندھوں پر پھینکتا
ہوں۔ آپ کی قیمتی رائے میری ادبی شاہراہ کے تاریک موڑوں پر سرچ لائٹ کا
کام دے گی۔

کوئی بھی دیباچہ اُسی وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ
اُس کے آخر میں اپنے اُن دوستوں، کرم فرماؤں اور ناشر صاحبان کا شکریہ
نہ ادا کیا گیا ہو جنہوں نے آپ کی کتاب چھپنے کے دوران کسی بھی مرحلہ پر آپ
کے سر پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھا ہو۔ لہذا میں بھی شری رام دلو جی، ڈاکٹر
مدن گوپال مہتہ، جناب جوہر گیرا، پریم کمار نظر اور شری چرنجیت جی اور کنور سین
حسرت کا سر سے لیکر پاؤں تک ممنون ہوں۔ اگر یہ اصحاب بنظرِ لطف میری مدد نہ کرتے
تو شاید یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں پہنچنے کی بجائے قلمی نسخے کی شکل میں ہی میرے ہاتھوں میں
محفوظ رہ جاتی اور میں اس جہانِ فانی سے کوچ کرتے وقت دوسرے ساز و سامان کے ساتھ اسے بھی
اپنے ہمراہ تابوت میں دبا لے جاتا۔

میں شبیقن لی کاک، شفیق الرحمان اور کنہیالال کپور جیسے بلند پایہ ادبا کا
بھی تہہ دل سے مشکور ہوں۔ انہی اصحاب کی بخیہ ادھیڑ تحریروں سے متاثر
ہو کر ہی میں نے تخیل کے گھوڑے کو اتنے زور سے چابک لگائے کہ وہ لنگڑا
کر چلنے کی بجائے سرپٹ دوڑنے لگ پڑا۔ اگر آپ کہیں اس گھوڑے کو ہانپتا
ہوا یا ہنہناتا ہوا دیکھیں تو اس میں مندرجہ بالا شہسواروں کا کوئی قصور
نہ پاکر اپنے اس ناچیز بندہ کو یاد کر لیجیے گا۔ شکریہ۔

"رام نواس"

۱۷ جنوری ۱۹۶۲ء "رام نواس" چھتہ بازار

ہوشیار پور — انباش حنیف مسعود

اُف میرے دوست

ایک وقت تھا صاحب میں ان لوگوں پر رشک کیا کرتا تھا۔ جن کے زیادہ سے زیادہ دوست ہوتے تھے۔ لیکن اب حال یہ ہے۔ کہ میں کسی شخص کی بدنصیبی کا اندازہ اس کے دوستوں کی تعداد سے ہی لگا لیتا ہوں۔ پہلے میں دوستوں کی صحبت کے بغیر ایک پل بھی نہیں کاٹ سکتا تھا۔ مگر اب حالات اتنے بدل گئے ہیں۔ کہ مجھے ان کا خیال ہی کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ ان سطور کو پڑھ کر شاید آپ کے دل میں یہ خیال آگیا ہو کہ صاحب مضمون بھی کیسا چغد ہے جو دوستوں جیسی نعمت کے بارے میں ایسے ایسے لغو جملے تحریر کر رہا ہے دیکھئے بندہ پرور۔ میرے اخلاق کا اندازہ لگانے میں اتنی جلد بازی اختیار نہ کیجئے۔ دوستوں کے ہاتھوں جو میری درگت بنی ہے۔ پہلے اس کی روداد سن لیجئے۔ اور بعد میں بڑے شوق سے میرے اخلاق کے متعلق فتوے صادر کر دیجئے گا۔ ہاں تو سنئے۔ دوستوں سے میری اس بیزاری کی وجہ

یہ ہے کہ انہوں نے مجھے اچھا خاصہ مفلس بنا دیا ہے سب کچھ مانگ کر لے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو جو چیزیں میں خود کسی سے مانگ کر لاتا ہوں وہ انہیں بھی مانگ کر لے جاتے ہیں۔ کوئی آتا ہے۔ تو "دیوانِ غالب" اٹھا کر لے جاتا ہے۔ کوئی اور آتا ہے تو "پانچ سالہ پلان" کو بغل میں دبا کر راستہ ناپتا ہوا، نظر آتا ہے۔ "جنتِ گم گشتہ" کا پتہ ہی نہیں کہ کس نے اغوا کر لی ہے۔ گرمیوں میں ایک دوست دھوپ کا چشمہ مانگ کر لے گئے تھے سردیاں آگئی ہیں لیکن چشمہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ کہنے کو تو میرے پاس ایک سائیکل بھی ہے۔ لیکن دفتر مجھے پیدل ہی جانا پڑتا ہے۔ بیچاری سائیکل اگر ایک دن ایک دوست کے نیچے ہوتی ہے تو دوسرے دن کسی اور کے ہاں۔ جتنا عرصہ وہ ٹھیک طرح سے چلتی رہتی ہے تب تک وہ میرے دوستوں کے پاس رہتی ہے۔ مگر جب کبھی پنکچر لگوانا ہو یا کوئی اور کسی قسم کی مرمت کروانی ہو تو میرے پاس پہنچ جاتی ہے اس لئے بعض اوقات تو یہ بھول ہی جاتا ہوں کہ میرے پاس کوئی ذاتی سائیکل بھی ہے۔ قصہ مختصر میری کتابیں۔ کپڑے۔ گھڑی۔ پین۔ کیمرہ اور ٹیبل لیمپ وغیرہ سب دوستوں کے گھر پر ہی ہیں۔ اس لئے جب کبھی میں اُن کے گھر جاتا ہوں۔ تب مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کہ میں اپنے ہی گھر میں بیٹھا ہوا ہوں۔ چیزیں مانگتے وقت وہ کچھ بھی نہیں سوچتے۔ لہٰذا ایک دن میرے ایک محترم دوست میری نظر کی عینک ہی مانگ کر لے گئے۔ کیوں کہ انہیں عینک لگا کر کسی ڈرامے میں پارٹ ادا کرنا تھا۔

اس وقت جبکہ میرے پاس اپنے دوستوں کو دینے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا ہے مجھے شک ہی نہیں بلکہ پختہ یقین ہو گیا ہے کہ میری شادی کے بعد وہ میرے سسرال سے آئی ہوئی سب چیزیں بھی مانگ کر لے جائیں گے ۔

میرے مہربان دوست صرف چیزیں مانگنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ کئی اور طریقوں سے بھی انہوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے ۔ وقت بے وقت آ دھمکتے ہیں ۔ اور کسی بھی طریقے سے (چاہے وہ کتنا ہی غیر مہذب کیوں نہ ہو) اس وقت تک واپس نہیں جاتے جب تک کہ خود ان کی طبیعت نہ چاہے ۔ میری طبیعت کے خلاف وہ بدستور اپنی باتیں سنانے چلے جائیں گے ۔ اپنی بیزاری کا اظہار کرنے کے لئے میں بہتیری جمائیاں اور انگڑائیاں لیتا ہوں لیکن وہ کچھ ایسی چکنی مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ میری اس اکتاہٹ کا ان پر رتی بھر اثر نہیں ہوتا ۔ ایک شاعر قسم کے حضرت آتے ہیں ۔ اور آتے ہی اپنے نئے نئے تحریر کردہ اشعار کی گولہ باری شروع کر دیتے ہیں ۔ جب تک اچھی طرح "بور" نہ کر لیں ہرگز ہرگز پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ اگر ان کی مرثیہ نما غزل کے اشعار کے ایک مصرعے کا وزن ڈیڑھ چھٹانک ہو تو دوسرے کا سیروں تک پہنچ جاتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ ایں حضرت اپنے آپ کو غزل کا بادشاہ کہنے میں ذرہ بھر شرم محسوس نہیں کرتے ۔ اکثر اپنا مقابلہ شکیل بدایونی سے کرتے رہتے ہیں ۔

ایک اور صاحب جب بھی ملتے ہیں۔ فوراً اپنی کسی نہ کسی بیماری کا تذکرہ شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے پہل وہ ان ڈاکٹروں، حکیموں اور ویدوں کے نام گنواتے ہیں جن کا علاج وہ کروا چکے ہیں۔ یا کروا رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس رقم کا حساب لگا کر سناتے ہیں جو کہ وہ انجکشن، جڑی بوٹیوں اور کشتوں وغیرہ پر خرچ کر چکے ہیں۔ جب ان چیزوں کا ذکر ختم ہو جاتا ہے تو وہ بیماری کی مختلف حالتوں کا مفصل اور سلسلے وار بیان شروع کر دیتے ہیں اور اس وقت تک ختم نہیں کرتے۔ جب تک کہ مجھ سے اپنی حالتِ زار پر خاطر خواہ رنج و غم، افسوس اور ہمدردی کا مکمل اظہار نہ کروا لیں۔ ان کی شخصیت کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ انہیں ہندوستان میں بنی ہوئی کوئی چیز پسند نہیں آتی۔ غیر ملکوں خاص کر انگلستان میں بنی ہوئی چیزوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ انگریزوں کے زبردست مداح ہیں اور بات بات میں ان کا حوالہ دے دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو چار فقرے ایسے پیش کرتا ہوں جو کہ ان کا تکیہ کلام ہیں۔ "انگلینڈ کی طرف دیکھو۔ وہاں کیا ہو رہا ہے"۔ "کم از کم انگلینڈ میں ایسا نہیں ہوتا کوئی انگریز ایسی حرکت نہیں کر سکتا"۔ "اجی کیا کہنے انگریز کے دماغ کے"......... اور میں ان کے منہ پر ہی کہہ دیتا ہوں "انگریز تو چلے گئے لیکن تمہاری صورت میں اپنی یاد چھوڑ گئے۔ ہندوستان چھوڑتے وقت وہ بیچارے ذرا جلدی میں تھے ورنہ وہ تمہیں ضرور اپنے ساتھ لے گئے" ہائے ستم!

ایک دوست ایسے بھی ہیں کہ جب کبھی وہ مجھ سے ملنے آتے ہیں تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ اب خانہ تلاشی ہونے والی ہے۔ "الف" سے لیکر "یے" تک

وہ کمرے کی تمام چھوٹی بڑی چیزوں کو اُتھل پتھل کر اُن کا ایک جاسوس کی طرح بغور معائنہ کرتے رہتے ہیں جس دن بھی یہ صاحب آتے ہیں اس دن شیشے یا چینی کی کوئی نہ کوئی چیز لازمی طور پر ان کے ہاتھوں شہید ہو کر مجھے ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے جاتی ہے۔

ایک اور صاحب جب کبھی مجھ سے ہاتھ ملا کر واپس جانے لگتے ہیں تو موسم کے مطابق ضرور کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کر دیتے ہیں۔ اگر گھر سے باہر دھوپ تیز ہو تو چھتری کی......... بارش ہو تو برساتی کی۔ .....اور اگر موسم معتدل ہو تو ریشمی مفلر ہی گلے کے ارد گرد لپیٹ کر چلتے بنیں گے۔ شاید انہوں نے اس مفلر کو چائے کا نعم البدل سمجھ رکھا ہے۔ جو گرمیوں میں ٹھنڈک اور سردیوں میں گرمی پہنچاتا ہے۔

جب کسی دوست نے سگریٹ پینے ہوتے ۔ تو وہ کسی پان سگریٹ والے کی دوکان کی بجائے سیدھا میرے گھر کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور آتے ہی خود کو صوفے میں دھنسانے کے بعد بڑی بے تکلفی سے سگریٹ کو ڈبے میں سے نکال کر سلگاتے ہوئے نہایت ہی اطمینان سے میز پر پاؤں جما کر کش پر کش لگانا شروع کر دیتا ہے۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ فضول گپوں میں ضائع کر کے جب دو تین سگریٹیں پی چکتا ہے تو مزید تین چار جیب میں ٹھونس کر پھر کبھی آنے کی دھمکی دیتا ہوا ٹہلتا ٹہلتا تشریف لے جاتا ہے۔

کچھ دن ہوئے میرے چند بے تکلف دوست کمرے میں گھس آئے تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور اس کے بعد پُر تکلف چائے کا دور چلا۔ اتنے میں میرے ایک دوست مسٹر پالی نے کہا۔ "ارے یار۔ وہ نئے ریکارڈ

ڈیسنواڑ جو تم پرسوں خرید کر لائے تھے۔ ان کی یہ فرمائش پوری کرنی پڑی۔ جب وہ ایک ایک ریکارڈ کو چار چار مرتبہ سن چکے تو ایک لمبی سانس لے کر بولے "واہ کتنے اچھے ریکارڈ ہیں۔ آج تو میں انہیں ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ ایک دو دن میں واپس کر دوں گا"۔ میں ابھی ریکارڈ دینے یا نہ دینے کی بابت ہی سوچ رہا تھا کہ وہ پھر بول اٹھے "ہاں خوب یاد آیا۔ گراموفون بھی ساتھ ہی لیتا جاؤں گا۔ کیونکہ ہمارا گراموفون میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں سے گر کر ناقابل استعمال ہو چکا ہے۔ سوئیوں کی ڈبی بھی ساتھ ہی رکھ دینا"۔ پہلے میں تو ریکارڈوں کی بابت ہی سوچ رہا تھا انہوں نے گراموفون اور سوئیوں کی فرمائش کر دی۔ کیا کرتا مجبور ہو کر یہ سب چیزیں دینی ہی پڑیں جب اس دوست کی فرمائش پوری ہو گئی تو باقی معزز دوستوں مسٹر سر سنیدر اور مسٹر پال نے سوچا کہ وہ بھی پال سے پیچھے کیوں رہیں۔ لہذا جاتی دفعہ ان میں سے ایک میز پر پڑا ہوا رسالہ "آج کل" لے گیا۔ دوسرے نے دست نے اٹھا کر پہن لئے .... اور تیسرے کو جب کچھ لے جانے کے لئے اور کچھ نہ سوجھا تو وہ پرانے اخباروں کی چار پانچ سیر ردی ہی اٹھا کر لے گیا لیکن میں نے پھر بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ کہ کہیں وہ مجھے ہی اٹھا کر نہیں لے گئے!

لیکن میں اس حادثے کے بعد بہت ہی عقلمند بن گیا۔ میں نے اپنے کمرے کی سب چیزیں اٹھوا کر ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیں۔ اب میرے کمرے میں صرف ایک صوفہ سیٹ، چار کرسیاں۔ ایک میز اور ایک دری رہ گئی تھی۔ میں بہت خوش تھا کہ اب میرے کمرے میں دوستوں کے مانگنے

کے لئے کوئی چیز نہ رہ گئی تھی۔ اب میں آرام سے بلا خوف و خطر اپنے کمرے
میں بیٹھتا۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی دوسرے کمرے سے لے آتا اور اُسے
استعمال کرنے کے بعد پھر وہاں ہی رکھ آتا۔ مگر افسوس میری بدقسمتی کے دن
ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ اچانک ہی ایک دن میرے عزیز دوست کرشن کمار
صاحب تین چار مزدوروں کے ساتھ تشریف لائے اور فرمانے لگے "جلدی
سے یہ صوفہ سیٹ، کرسیاں، میز وغیرہ ان لوگوں کے سر پر اُٹھا دو
کیوں کہ اگلے ہفتے میری بہن کی شادی ہے اور ہمیں ان چیزوں کی سخت
ضرورت ہے"۔ میں ابھی اس ناگہانی مصیبت کی بابت سوچ ہی رہا تھا کہ
مزدوروں نے جھٹ پٹ یہ چیزیں اپنے سروں پر اٹھائیں اور میرے عزیز دوست
کے ہمراہ چلتے بنے۔ میں اپنا سر پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے دوستوں کی
جان کو دعائیں دینے لگا۔ اب میرے کمرے میں فرش کی اینٹیں باقی رہ گئی
ہیں مگر ان کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔ پتہ نہیں کب کوئی ضرورت مند دوست
آئے اور اُنہیں بھی اکھاڑ کر چلتا بنے۔

دیکھ لی آپ نے میرے دوستوں کی کرم فرمائیاں۔ انہوں نے تو میرا دیوالہ
ہی نکلوا دیا ہے۔ اس لئے اب اُن سے ملنا تو درکنار مجھے ان کے سائے سے
بھی ڈر لگتا ہے کم بخت خوابوں میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ جب کبھی نظر آ جاتے
ہیں۔ کبھی نہ کبھی چیز کی فرمائش کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے دشمن تو ہمیں گھر سے باہر ہی
نقصان پہنچاتے ہیں لیکن دوست صاحبان دشمنوں سے بھی خطرناک ہیں کیونکہ
یہ گھر کے اندر بھی سکھ کا سانس نہیں لینے دیتے۔ ان سب حالات کو دیکھتے
ہوئے اب میں بے ساختہ پکار اٹھتا ہوں "خدا دوستوں سے سب کو بچائے"۔

جب خدا ہندوستان میں آیا

ایک دن بیٹھے بٹھائے نہ جانے خدا کے دل میں کیا خیال آیا کہ وہ ایک انسان کے بھیس میں ہندوستان کی سرزمین پر اتر آیا۔ سب سے پہلے وہ پرانا مندر نئی دہلی میں گیا۔ شام کا وقت تھا بھگوان کے بھگت شری لکشمی نارائن جی کی آرتی اتار رہے تھے۔ جب آرتی ختم ہوئی تو خدا لکشمی نارائن کی مورتی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور مزے سے پاس رکھا ہوا بھوگ چکھنے لگا۔ خدا کی اس بدتمیزی پر بھگتوں کو غصہ آگیا۔ پجاری جی کڑک کر بولے "یہ کیا بیہودگی ہے۔ کون ہو تم۔ یہاں کیوں گھسے ہو؟" خدا نے بڑی نرمی اور پریم سے کہا "پہچانا نہیں آپ نے مجھے پجاری جی۔ میں بھگوان ہوں۔ آپکا پرماتما جس کی آپ ابھی ابھی آرتی اتار رہے تھے" یہ سنتے ہی پجاری جی نے کچھ اس طرح برا سا منہ بنایا جیسے انہوں نے ابھی ابھی کوئی کڑوی اور کسیلی دوائی پی ہو۔ چند لمحوں بعد وہ طنزیہ انداز میں بولے "اچھا تو آپ بھگوان ہیں۔ ہونہہ۔ شکل دیکھی ہے اپنی ذرا آئینے میں" پھر خدا کو بازو سے کھینچ

کر گھسیٹتے ہوئے کہنے لگے "رحیل نکل یہاں سے بہروپیا کہیں کا۔ سارے شہر کا سارا بھوگ خراب کر کے رکھ دیا۔ بھگوان سکھ گھر تیں کھڑے ہو تو بچ گئے ہو ورنہ مار مار کر تمہارا برا حال کرتے کہ تم اپنے آپ کو پیا سمجھتا تو کیا چھوٹا موٹا دیوی دیوتا بھی نہ کہتے" اس کے بعد پجاری جی اور بھگت لوگ خدا کو گھسیٹ کر مندر کے باہر لے گئے اور اُسے دھکا مار کر سیڑھیوں سے نیچے دھکیل دیا تھا۔ اس کی کہنیاں اور گھٹنے چھل گئے۔ اُسے بہت غصہ آیا۔ اس کے دل میں آ رہا تھا کہ اسی وقت ان لوگوں کو اُن کی گستاخی کی سزا دے دی جائے مگر وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ وہ تو انسان کے بھیس میں آیا ہوا ہے تاکہ لوگوں کے بیچ گھوم پھر کر اُن کی صحیح حالت کا جائزہ لے سکے۔

اس کے بعد خدا جامعہ مسجد واقع پرانی دہلی میں آیا۔ یہاں اللہ کے بندے ابھی ابھی شام کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تھے۔ خدا اُن کے درمیان گیا اور زور سے بولا "فرزندانِ اسلام تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آج تمہارا خدا ...... تمہارا اللہ بہ نفسِ نفیس تمہارے درمیان کھڑا ہے۔ میں دنیا میں آج اس لئے آیا ہوں تاکہ اپنے بندوں کی تکلیفوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں میں نے انسان کا بھیس اس لئے بنایا ہے تاکہ تمہارے تمام دکھوں اور تکلیفوں کو تمہاری طرح محسوس کر سکوں۔ دوسرے تم میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے کہ میرے نور کے دیدار کی تاب لا سکو۔ کیونکہ یہ تو تمہیں بخوبی معلوم ہی ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ کوہِ طور پر کیا گزری تھی۔ اس لئے اے مسلمانو! مجھے بتاؤ کہ تمہاری تکلیفیں کیا کیا ہیں"

یہ سنتے ہی لوگوں کے ہجوم میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ کچھ لوگ قہقہے لگانے لگے ایک صاحب اپنے ساتھیوں سے فرمانے لگے "یہ بھی صاحب۔ آ گئے تو خلیفے

ہی پیدا ہوتے تھے جیسے کہ خلیفہ قادیانی مگر آج خود حضرت خدا بنفس نفیس اس دنیا میں ٹپک پڑے ہیں۔" یہ سن کر ان صاحب کے ساتھیوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور خدا کی طرف دیکھنے لگے۔ خدا کو دیکھنے کے لیے پھر قہقہہ لگا۔ اسی طرح خدا کو کئی بار دیکھا گیا اور قہقہے لگائے گئے۔ ایک جوشیلے مولوی صاحب فرمانے لگے " باہر نکالو کافر کو۔ یہ خدا کے گھر کو ناپاک کرنے آیا ہے۔ خبیث کہیں کا ضرور اسے سندھی بھائیوں نے بھیجا ہوگا۔" یہاں بھی خدا کا وہی حشر ہوا۔ جو برلا مندر میں ہوا تھا۔

جامع مسجد سے بے آبرو ہو کر نکلنے کے بعد خدا چاندنی چوک کے گردوارہ میں جا پہنچا۔ وہاں اس نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا " میرے پیارے اور بہادر بچو۔ میں تمہارا واہگورو ہوں۔ تمہارا کرتار ہوں۔ اسے گورو کے پیارو تم مجھے اپنی تکلیفیں بتاؤ۔ میں انہیں دور کروں گا۔" یہ سنتے ہی ایک سردار صاحب دوسرے سردار صاحب سے فرمانے لگے " لو۔ سردار جی سنیا۔ کی کہندا اے" (لو۔ سردار جی سنا۔ کیا کہتا ہے؟) دوسرے سردار جی بولے " آہو جی سنڑیا اے۔ مینوں تاں اے کوئی پاکھنڈی لگدا اے۔ ہووے نہ ہووے اسے ضرور مسلماناں دا جاسوس اے" (جی ہاں۔ سنا ہے مجھے تو یہ کوئی پاکھنڈی معلوم ہوتا ہے۔ ہو نہ ہو یہ ضرور مسلمانوں کا جاسوس ہے) ان دونوں کے پاس ہی کھڑے ہوئے ایک تیسرے سردار صاحب نے ہمدردی کے لہجے میں کہا " مینوں تاں بیچارا کوئی دکھی لگدا اے۔ شاید جاچیرا دیاں ہتھے دا لعل مرے غم وچ پاگل ہو گیا اے" (مجھے تو بیچارہ کوئی دکھیارا معلوم پڑتا ہے۔

شاید صاحب سنگھ داد یا دوستے داروں کے غم میں پاگل ہو گیا ہے۔ غرضیکہ خدا کو
یہاں سے بھی نکال دیا گیا۔ مگر خدا کو یہاں دھکے نہیں ملے بلکہ اُسے معقول
سا حلوے کا پرشاد دے کر ہمدردی سے گوردوارہ کے باہر چھوڑ دیا گیا۔

وہ کچھ سوچتا سوچتا لال قلعے تک جا پہنچا۔ رات ہو چکی تھی لال قلعے کے
سامنے والے میدان میں گھاس پر بیٹھ کر وہ پھر کچھ سوچنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا
کہ لوگوں کو کس طرح یقین دلایا جائے کہ واقعی وہ خدا ہے۔ آخر اسے ایک
ترکیب سوجھ ہی گئی۔ اس نے منہ میں کچھ منتر پڑھا۔ دوسرے ہی لمحے اس
ہاتھ میں ایک بیگ تھا جس میں سو سو کے بے شمار نوٹ پڑے ہوئے
تھے۔ خدا نے فوراً ایک ٹیکسی لی اور اشوکا ہوٹل میں ایک کمرہ ریزرو کروانے
کے بعد روزانہ اردو اخبار "تیج" کے دفتر واقع ہرن منٹس روڈ پر جا پہنچا
ایڈورٹائزنگ مینیجر (advertising Manager) کے کمرے میں
پہنچ کر اس نے ایک اشتہار کا مضمون تیار کیا اور اسے مینیجر صاحب کے سامنے
پیش کر کے چھپوائی کی اُجرت پوچھی اور ساتھ ہی یہ شرط رکھی کہ یہ اشتہار
اخبار کے پہلے صفحے پر چھاپا جائے اور اس صفحے پر دیگر کوئی خبر یا اشتہار وغیرہ
نہ ہو۔ اشتہار کا مضمون پڑھ کر ایڈورٹائزنگ مینیجر صاحب چونک اٹھے۔ مضمون
یہ تھا۔

دلی میں خُدا کی آمد

میرے پیارے بچو۔ میں یعنی خدا۔ ایشور گاڈ یا واہگورو
جو کچھ ہے آپ کی مرضی ہو سمجھ لیں۔ آپ کی اس دنیا میں ایک انسان کے روپ میں

آچکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی طرح ایک عام انسان بن کر آپ کے دکھوں اور تکلیفوں کو آپ ہی کی طرح محسوس کروں اور اُن کو دور کرنے کی کوشش کروں اسی سلسلے میں میں برلا مندر، جامع مسجد اور چاندنی چوک کے گوردوارے تک گیا۔ مگر کسی بھی شخص نے میرا اعتبار نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا سے زبان کا اعتبار بالکل اٹھ گیا ہے۔ لہذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں لوگوں کو اپنے خدا ہونے کا یقین دلانے کے لئے کوئی معجزہ کر کے دکھاؤں۔ اس لئے آپ سب کو اس اشتہار کے ذریعہ مطلع کیا جاتا ہے کہ میں پرسوں یعنی مئی کی دو تاریخ کو دوپہر کے عین بارہ بجے سورج کو پانچ منٹ کے لئے غروب کر دونگا اور آپ کو دن کو تارے دکھا دونگا۔ امید ہے اس طرح آپ کو مجھ پر یقین آ جائے گا۔

میں ہوں آپکا خیر خواہ

"خدا"

اشتہار کا مضمون پڑھنے کے بعد منیجر صاحب نے خدا کو ایسی نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں "اچھا حضرت آپکا دماغ تو صحیح ہے نا؟" خدا نے منیجر صاحب کا مطلب سمجھ لیا اور ہنس کر بولا "میرا دماغ بالکل صحیح ہے۔ آپ ایک فیصدی بھی فکر نہ کریں"۔ منیجر صاحب ذرا کھسیانے ہو کر بولے "نہیں میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے ہمیں تو اشتہار چھاپنے کی اجرت لینی ہے چاہے آپ کیسا ہی مضمون کیوں نہ لے آئیں۔ ہاں تو پہلے صفحہ پر حضرت آپکا اشتہار ہی چھپ جائے گا لیکن پانچ ہزار روپے

لگیں گے "اجی منیجر صاحب آپ روپیوں کی بات چھوڑ دیجئے۔ پانچ ہزار چھوڑ کر میں دس ہزار روپے دونگا۔ یہ کہکر خدا اسنے واقعی بیگ سے دس ہزار نوٹوں کو ایک بنڈل نکال کر منیجر صاحب کے میز پر رکھتے ہوئے کہا "لیجئے آپ دس ہزار ہی لیجئے" منیجر صاحب ہکے بکے رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو صرف پانچ ہزار ہی لونگا" "میں تو دس ہزار ہی دونگا" خدا اسنے اصرار کیا۔ تھوڑی دیر تک یہ پانچ ہزار اور دس ہزار کا تکلف چلتا رہا۔ آخر منیجر صاحب کو ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ انہوں نے خدا اسے کہا "اچھا صاحب، دس ہزار ہی لے لیتے ہیں آپ کا اشتہار کل دوبارہ شائع کر دیا جائے گا" خدا منیجر صاحب کی اس عقلمندی کی داد دیئے بنا نہ رہ سکا۔ منیجر صاحب نے کس صفائی سے اپنی اور خدا العینی دونوں کی بات رکھ لی تھی۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد خدا ایڈ تاپ ہندوستان ٹائمز ٹائمز آف انڈیا و دیگر اخبارات کے دفاتر میں گیا اور انہیں بھی اپنا اشتہار دو دفعہ چھپنے کے لئے دے دیا۔

دوسرے دن صبح جب یہ اخبارات لوگوں کے ہاتھوں میں گئے تو سارے ہندوستان میں اس اشتہار کو دلچسپی اور حیرانی سے پڑھا گیا لوگ حیران ہو رہے تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ وہ اشتہار پڑھ رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے۔ حیران ہو کر پھر پڑھتے اور پڑھ کر پھر حیران ہو رہے تھے ہر جگہ بجگہ اسی عجیب و غریب اشتہار کا

ذکر ہو رہا تھا - یوں یوں دن چڑھتا گیا - توں توں اس اشتہار کا ذکر بھی بڑھتا گیا - گلیوں اور بازاروں میں، دوکانوں اور دفتروں میں، ہوٹلوں اور کلبوں میں اسی اشتہار پر رائے زنی ہو رہی تھی - ایک صاحب فرما رہے تھے "میرے خیال میں تو یہ کسی سر پھرے امیر آدمی کا کارنامہ ہے جس نے پاگل پن کے جوش میں آکر اخباروں میں ایسا اشتہار دے دیا - اخبار والوں نے تو اسے چھاپنا ہی تھا کیونکہ انہیں تو روپے سے غرض ہے اور روپے انہیں اس پاگل امیر سے مل ہی گئے ہوں گے"۔ ایک اور صاحب کہہ رہے تھے "سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے - اگر کل کو "فرسٹ اپریل" (FIRST APRIL) ہوتا تو ہم اسے اخبار والوں کی شرارت سمجھ لیتے مگر "فرسٹ اپریل" کو گزرے ہوئے بھی ایک مہینہ ہو گیا ہے - میرے خیال میں تو کسی منچلے نے "فرسٹ اپریل فول" کی بجائے "سیکنڈ مے فول" (Second May Fool) بنانے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ بھی بہت وسیع پیمانے پر"

ایک پنڈت جی فرما رہے تھے "یہ اشتہار دینے والے ضرور "کلکی بھگوان" ہوں گے کیونکہ شاستروں کے کہنے کے مطابق آجکل ہی "کلکی اوتار" ہونے کا سمے (وقت) ہے - بھگوان کرشن نے بھی تو گیتا میں فرمایا ہے کہ جب سنسار میں پاپ حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور لوگ اپنے دھرم کرم کو بھول جاتے ہیں تو ایسے سمے میں میں اوتار لیتا ہوں کیونکہ آجکل پاپ اور بھرشٹاچار (بے ایمانی) حد سے زیادہ بڑھ گئے ہیں اس لئے ضرور بھگوان نے جنم لے لیا ہے"

دو مئی کو اخباروں میں یہ اشتہار پھر شائع ہوا - آج لوگوں میں کل سے بھی

زیادہ جوش و خروش پایا جاتا تھا کیونکہ اشتہار کے مطابق آج ٹھیک بارہ بجے سورج نے پانچ منٹ کے لئے غروب ہونا تھا۔ ہندوستان کے کونے کونے میں اسی اشتہار کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ لوگوں کا اشتیاق حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا اور وہ بڑی بے صبری سے بارہ بجنے کا انتظار کر رہے تھے اُسی دن دوکانوں، کارخانوں اور دفتروں وغیرہ میں کہیں بھی معمول کے مطابق کام شروع نہ ہو سکا۔ مالک اور نوکر، کلرک اور افسر سب اسی اشتہار کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ کوئی دوسری بات اُنہیں سوجھتی ہی نہیں تھی۔ وہ بار بار بے تابی سے اپنی اپنی گھڑیوں کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک ایک منٹ ایک ایک گھنٹے کے برابر ہو گیا ہے۔

بارہ بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ لوگوں میں ایک قسم کی ہیجانی کیفیت پائی جاتی تھی۔ وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

بارہ بجنے میں دو منٹ رہ گئے تھے۔ لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ سارے ہندوستان کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھی۔ سب لوگ گھروں، دوکانوں اور دفتروں سے باہر نکل آئے تھے گلیوں، بازاروں، سڑکوں، پارکوں اور مکانوں کی چھتوں پر انسانی سروں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ مئی کے تپتے ہوئے سورج کی دھوپ میں بھی لوگ بڑے اشتیاق سے کسی انوکھی چیز کو دیکھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ دھوپ کی شدت کی وجہ سے لوگوں کے گال تمتما رہے تھے۔

وہ بار بار اپنی انگلیوں سے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کے قطروں کو صاف کر رہے تھے۔ پانی کے گلاس کے گلاس پیئے جا رہے تھے۔ کئی جگہ بالنس کی تتلیوں پر چپکائی ہوئی آئس کریم کی قلفیاں کھائی جا رہی تھیں۔ کئی عورتوں کی گود میں ننھے منے بچے دھوپ کی شدت کی وجہ سے بلک رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب قسم کا شور مچا ہوا تھا۔ یہ شور ایسے شور سے مشابہ تھا جو کہ کسی جلسہ گاہ میں کسی بڑے لیڈر کے آنے سے پہلے عموماً ہوتا ہے۔

بارہ بجنے میں چند سیکنڈ رہ گئے تھے۔ ایک شخص نے اپنے ساتھی سے کہا "لو بھئی نظارہ دیکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" اسے نظارہ کیا دیکھنا ہے میں تو کہتا ہوں کسی منچلے نے تمام ہندوستان کو بے وقوف بنا دیا ہے۔ بھلا کبھی دوپہر کو سورج غروب ہو کر تارے دکھائی دے سکتے ہیں؟" ابھی اس شخص کے دہان سے یہ الفاظ پوری طرح نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ ٹھیک بارہ بج گئے۔ سورج یکدم غائب ہو گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی آسمان نے سیاہ رنگ لیا ہے۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ آسمان پر تارے دکھائی دینے لگے۔ گرمی کی جگہ خنکی نے لے لی۔ ابھی ابھی جو لوگ گرمی کی وجہ سے پسینے میں شرابور تھے، اب وہ تھوڑی سردی محسوس کرنے لگے۔ اندھیرے میں مختلف قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی ایشور بھگت کہہ رہا تھا "دھن ہو بھگوان۔ تمہاری لیلا اپرم پار ہے۔" بہت سے لوگ زور زور سے اس طرح ہرے رام، ہرے رام کی رٹ لگانے لگے جیسے کہ خود خیال کے آنے پر لگتی ہے۔ بعض جگہوں پر تو باقاعدہ کیرتن ہونے لگا: ہرے راما ہرے کرشنا، کرشنا کرشنا ہرے

ہو رہے"۔ مسلمانوں نے خدا کی تعریف میں قوالیاں اور نعتیں گانا شروع کر دیں
سکھوں نے زور شور سے شبد گانے شروع کر دیئے۔ لمحہ بہ لمحہ کیرتن کرنے
والوں کی نعتیں اور شبد گانے والوں کی آوازیں اُونچی اور تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ اُن
کے جوش و خروش سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اب ہندوستان میں
کوئی ناستک نہیں رہا ہے۔ سب روحانیت کے رنگ میں رنگے گئے ہیں

بارہ بجکر پانچ منٹ ہو گئے۔ نہ جانے سورج کہاں سے پھر
یکدم نکل آیا۔ تاریکی اُجالے میں بدل گئی۔ لوگ یکدم اس تیز روشنی کی تاب نہ لا
سکے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ انہوں نے اپنی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ
لئے اور تھوڑی دیر بعد آہستہ آہستہ اٹھ گئے۔ سب لوگ گلیوں، بازاروں اور
چھتوں سے واپس اپنی اپنی جگہ آ گئے۔ رکا ہوا ٹریفک پھر سے جاری ہو گیا
لوگوں میں ایک نئی زندگی کی لہر پائی جاتی تھی۔ عام طور پر یہی چرچا تھا کہ ست
یگ آگیا ہے۔

اس معجزے کے بعد نامہ نگاروں کو خدا کی تلاش ہوئی۔ انہوں نے
اُن اخباروں کے دفتروں میں جا کر خدا کا پتہ معلوم کیا جن میں اس کا
اشتہار چھپا تھا۔ خدا کا پتہ تھا "کمرہ نمبر ۱۶ اشوکا ہوٹل۔ نیو دہلی"

تھوڑی ہی دیر میں اشوکا ہوٹل میں نامہ نگاروں اور فوٹو گرافروں کا
ہجوم جمع ہو گیا۔ خدا کے متعدد فوٹو لئے گئے۔ خدا نے پریس میں چھپنے کے لئے
ایک بیان بھی دیا۔ آل انڈیا ریڈیو (آکاش وانی) کے نامہ نگار نے خدا سے
ریڈیو پر ایک تقریر براڈکاسٹ کرنے کی درخواست کی جسے خدا نے

بخوشی منظور کر لیا۔ تقریر کا وقت ساڑھے آٹھ بجے شام مقرر کیا گیا۔
اُسی روز دوپہر کو ریڈیو پر ایک بجکر چالیس منٹ والی خبروں کے
بُلیٹن کو اس طرح سنایا گیا:۔ "آکاش وانی ہے۔ اس وقت ایک بجکر چالیس
منٹ ہوئے ہیں۔ اب آپ دیوکی نندن پانڈے سے ہندی میں سماچار
سنئے۔ آپ کو یہ سُن کر اتینت پرسنتا (نہایت خوشی) ہوگی کہ پرم تپیا بھگوان
آجکل بھارت میں پدھارے ہوئے ہیں اور وہ اشوکا ہوٹل نئی دہلی میں
مقیم ہیں۔ آج دوپہر کو بارہ بجے سورج جو پانچ منٹ کے لیے اُلوپ (غائب)
ہوگیا تھا۔ وہ بھگوان کی ہی وشال شکتی (عظیم طاقت) کا ایک چھوٹا سا نمونہ
تھا۔ انہیں اپنی شکتی کا پردرشن (مظاہرہ - نمائش) اس لیے کرنا پڑا کہ
لوگوں کو اُن کے بھگوان ہونے میں کوئی شک نہ رہے۔ انہوں نے ہمارے
سمواد داتا (نامہ نگار) سے کہا ہے کہ وہ دھرتی پر انسان کے روپ میں
اس لیے آئے ہیں تاکہ وہ جنتا کی تکلیفوں کا اندازہ اچھی طرح لگا سکیں۔
آج شام کو ساڑھے آٹھ بجے پرم تپیا بھگوان جی ریڈیو پر راشٹر کے نام ایک سندیش
براڈکاسٹ کریں گے۔ یہ سندیش آکاش وانی کے تمام کیندروں سے ایک
ساتھ پرسارت (ریلیز) کیا جائے گا۔"
ریڈیو پر خبریں سُننے کے بعد لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم
اشوکا ہوٹل کے سامنے خدا کے درشنوں کے لیے جمع ہوگیا۔ خدا نے انہیں
کئی دفعہ درشن دیئے مگر ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آس پاس کی تمام سڑکوں پر
ٹریفک بند ہوگیا۔ ہجوم خدا کو دیکھنے کے لیے بار بار نعرے لگا رہا تھا۔

ہوٹل والوں نے جب دیکھا کہ ہجوم کے جوش و خروش کی وجہ سے ہوٹل کی عمارت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو انہوں نے فوراً پولیس کو ٹیلیفون کیا۔ پولیس آ گئی اور خدا کو چپکے سے پوشیدہ طور پر نکال کر ایک نامعلوم مقام پر لے گئے یہاں سے گھر سے کچھ ہی دیر بعد وہ اندر ہی کہیں پہنچا دیا گیا۔

ریڈیو پر ہر پانچ منٹ کے بعد خدا کے تقریر کرنے کا اعلان ہو رہا تھا۔ سارے ملک میں ایک قسم کی ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ لوگ خدا کو دیکھنے کے اشتیاق میں دہلی چل پڑے تھے۔

شام کو کئی اخباروں نے خاص ایڈیشن شائع کئے۔ جس میں خدا کے دہلی آنے، برلا مندر اور جامع مسجد وغیرہ سے بے آبرو ہو کر نکلنے، اشتہار دینے اور سورج کو غروب کرنے کے حالات چھپے ہوئے تھے۔ اسی ضمن میں چند ایک دلچسپ خبریں بھی چھپی ہوئی تھیں۔ وہ یہ تھیں کہ جب سورج کے غروب ہو جانے پر پانچ منٹ کے لئے اندھیرا چھا گیا تو چوروں کے لئے ایک نادر موقعہ ہاتھ آ گیا۔ انہوں نے کئی دکانوں کی تجوریاں صاف کر دیں۔ جیب کتروں کے بھی وارے نیارے ہو گئے۔ چند غنڈوں نے اندھیرے میں عورتوں سے چھیڑ خانی بھی کی۔

ایک خبر یہ بھی تھی کہ دوپہر کو سورج کے یکدم چھپ جانے کی وجہ سے پسینے میں شرابور لوگوں میں سے کئی ایک کو اچانک سردی محسوس ہونے کی وجہ سے نزلہ اور زکام کی شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ چند ایک نازک طبیعت والوں کو تو نمونیا بھی ہو گیا ہے اور پانچ منٹ کے مسلسل اندھیرے سے

کے بعد یکدم سورج نکلنے سے کئی آدمیوں کی بینائی پر بھی برا اثر پڑا ہے۔

شام کے ساڑھے آٹھ بجنے والے تھے۔ تمام لوگ ریڈیو پر خدا کی آواز سننے کے منتظر تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے اناؤنسر نے اعلان کیا کہ ہم آکاش وانی کے دہلی کیندر سے بول رہے ہیں۔ اب وقت شام کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ اب آپ پرم پتا پرمیشور شکتیمان شری بھگوان جی کا سندیش سنیں گے۔ یہ سندیش آکاش وانی کے تمام کیندروں سے ایک ساتھ براڈکاسٹ کیا جا رہا ہے۔

خدا کی تقریر شروع ہوئی۔

"میرے پیارے بچو۔

میں اپنے آپ کو آپ کے درمیان پا کر بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ میرا اس دنیا میں آنے کا [illegible] ([illegible]) تو کچھ نے پڑھ ہی لیا ہوگا۔ میں ایک انسان کے روپ میں آپ کے دکھوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا اندازہ کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ آکاش میں میرے کانوں میں وقتاً فوقتاً اس دنیا کی طرف سے کئی ایسی آوازیں اور فریادیں سنائی دیتی رہتی تھیں۔ جیسے کہ "جا رے بڑے بھگوان تیرے انسان جو تو جانیں"۔ اور دنیا بنانے والے ذرا سامنے تو آ" "بھگوان تو بھی ذرا انسان بن کے دیکھ"۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو میں نے ایسی آوازوں کو سن کر یہ ڈسائیڈ (decide) کیا کہ میں انسان کے بھیس میں دھرتی پر جاؤں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ میں مندر، مسجد اور گوردوارے میں گیا مگر مجھ پر کسی نے اعتبار نہیں کیا۔ اس لئے مجھ کو اپنے خدا ہونے کا یقین دلانے کے لئے سورج کو چھپا کر دن کو تارے دکھانے کا میریکل (Miracle) یعنی معجزہ کرنا پڑا۔

یہاں میں ایک بات آپ سے کلیر (CLEAR) کرنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے
کہ آپ ضرور میری اس ہندی اردو اور انگریزی کی کھچڑی زبان کو سن کر ہنستے
ہوں گے مگر میں کیا کروں مجبوری ہے۔ اگر میں کسی ایک زبان میں تقریر کروں تو
دوسری زبان بولنے والے مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ وہ مجھ پر الزام لگائیں گے
کہ میں دوسرے مذہب والوں کی فیور (FAVOUR) کرتا ہوں اس لئے مجھے یہ کھچڑی
زبان بولنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

ہاں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے ان فریادوں کو سن کر زمین پر آنا ہی پڑا۔ میں کل
رام لیلا گراؤنڈ میں ایک دربار منعقد کر رہا ہوں جس میں آپ لوگوں کی شکایتیں سنوں
گا۔ اور حتی الوسع انہیں دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ دربار کل شام کو پانچ
بجے لگے گا۔

آخر میں میں آپ سے مل جل کر رہنے کی اپیل کرتا ہوں۔ تمام مذاہب کے
لوگ میرے ہی بندے ہیں۔ کسی دوسرے مذہب کے لوگوں سے نفرت مت کرو۔
زبان کے جھگڑوں میں نہ پڑو اسی میں آپ کی بھلائی ہے سچے بندو

اس رات خدا کے اعزاز میں راشٹرپتی بھون میں ایک شاندار ڈنر پارٹی
دی گئی اور غیر ملکی سفیروں اور دیگر بڑے بڑے لوگوں کو خدا سے متعارف
کرایا گیا۔ غیر ملکی سفیروں نے خدا کو اپنے اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی
جس کے جواب میں خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ مناسب وقت آنے پر
ان کے ملک کا بھی دورہ کرے گا۔

اس رات کو مندروں، مسجدوں، گردواروں اور گرجا گھروں میں خاص پرارتھنا

سے بنیں بھی منعقد کی گئیں اور لوگ ساری رات خدا کی تعریف میں بھجن نعتیں اور شبد وغیرہ گاتے رہے۔

دوسرے دن اخباروں نے خاص ایڈیشن شائع کئے جن میں خدا کی تصویریں اور اس کے دنیا میں آنے کا مکمل حال چھپا ہوا تھا۔ خدا کے بارے میں لمبے لمبے ایڈیٹوریل لکھے گئے۔ ذیل میں چند ایک اخبارات کے ایڈیٹوریلز کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

ہندو سبھا کے اخبار روزانہ "اکھنڈ بھارت" نے لکھا: "بھگوان ایک دفعہ پھر سے بھارت میں آ کر اس کی پرانی عظمت کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ دنیا کو ماننا ہی پڑے گا کہ بھارت دیوی دیوتاؤں کا دیش ہے۔ اسی دیش میں سے ہی تمام دنیا کو روحانیت کا سبق مل سکتا ہے۔" آخر میں لکھا تھا: "بھارت کے سب نر ناری بھگوان کا ہاردک سواگت پورے دل سے استقبال کرتے ہیں اور ان کے پوتر چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول پیش کرتے ہیں۔"

اکالی اخبار روزانہ "پنجابی صوبہ" نے لکھا: "ہمیں بھگوان کی ہندوستان میں تشریف لانے کی خوشی ہے لیکن ساتھ ہی اس بات کا رنج بھی ہے کہ انہوں نے یہاں اپنی تقریر میں ہندی، اردو اور انگریزی کے الفاظ مل گھول کر استعمال کئے وہاں بھولے سے بھی پنجابی کا ایک لفظ بھی ان کی زبان سے نہیں نکلا۔ اور نہ ہی انہوں نے اپنی تقریر میں پنجابی صوبے کے بارے ذکر کیا جو کہ سکھوں کی سب سے بڑی مانگ ہے۔ بھگوان کی اس تقریر سے مایوس ہو کر پنتھ رتن ماسٹر تارا سنگھ جی نے فیصلہ کیا ہے

کر احتجاج کے طور پر بھگوان کے پاس دہلی یا جتھے بھیجے جائیں۔ یہ سب جتھے پیدل مارچ کریں گے اور یہ دہلی پہنچ کر اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک کہ بھگوان ان سے پنجابی صوبہ بنانے کے سوال پر غور کرنے کا وعدہ نہ کر لیں۔"

کمیونسٹوں کے اخبار "کسان مزدور راج" نے لکھا: "نہ جانے کل کانگریسیوں نے کہاں سے ایک جادوگر کو بلا کر اس کی شعبدے بازی کے ذریعہ تمام ہندوستان میں دوپہر کے بارہ بجے پانچ منٹ کے لیے سورج کو غروب کروا دیا اور مشہور یہ کر دیا کہ یہ شخص مار جانہ گرو) خدا ہے۔ ہم عوام کو سامراجیوں کی اس خطرناک اور مکروہ چال سے خبردار کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ نام نہاد خدا کی آمد محض ایک چال ہے۔ اب سامراجی اس شخص کو اپنے پراپیگنڈے کے لیے استعمال کریں گے۔ عوام کو پھر سے مذہب کے جال میں پھنسانے کی کوشش کریں گے اور اس طرح ان کی توجہ سیاسی اور معاشی معاملات کی طرف سے ہٹانے کی ذلیل چال چلیں گے۔" آگے چل کر لکھا تھا: "روسی سائنسدان اس شعبدہ بازی کے متعلق سر توڑ تحقیق کر رہے ہیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ جلد ہی وہ اس نام نہاد خدا کی خدائی ڈھول کا پول کھولنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور سامراجی چالوں کو بے نقاب کر دیں گے۔ سائنس کی اس ترقی میں اب شعبدوں کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔"

اگلے دن یعنی ۳ مئی کی شام کو رام لیلا گراؤنڈ میں خدا کا شاندار دربار لگا۔ بڑے بڑے شامیانے لگائے گئے۔ خدا کے بیٹھنے کے لیے ایک بلندی پر خوبصورت اور قیمتی تخت رکھا گیا اور اس صوفے کے ارد گرد لفین

دائرے کی شکل میں دور دور تک بڑے بڑے آدمیوں کے بیٹھنے کے لئے معزز
صوفے بچھے ہوئے تھے۔ جنتا کے لئے دریاں بچھائی گئی تھیں۔ لاؤڈ سپیکروں
کا خاطر خواہ انتظام تھا۔ ٹھیک پانچ بجے خدا کی کار جلسہ گاہ میں پہنچی۔ پنڈال
LONG LIVE GOD
عقیدتمندان کی جے ہو۔ "خدا زندہ باد" اور "لانگ لیو گاڈ"
کے نعروں سے گونج اٹھا۔ خدا اپنے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب اس نے
آس پاس کے صوفوں پر نظر ڈالی تو ان میں سے کئی صوفے اسے خالی نظر آئے۔
چند لمحوں کے بعد خدا اٹھا اور اس نے مدعو شدہ لیڈروں کی دیر سے پہنچنے کی
عادت پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے ایک مختصر سی تقریر کی اور اس کے بعد عدالتی
شروع کرنے کا حکم دیا۔ دربار کے سیکرٹری نے لاؤڈ سپیکر پر دربار کی باقاعدہ
کاروائی شروع ہونے کا اعلان کیا اور لوگوں سے کہا کہ وہ باری باری اپنی شکائتیں
خدا کے حضور میں پیش کر سکتے ہیں۔ پیشتر اس سے کہ کوئی شخص آ کر اپنی فریاد
سناتا جلسہ گاہ کے باہر ایک شور سا برپا ہو گیا۔ زور زور سے نعرے
لگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ نعرے کچھ اس قسم کے تھے "ہمیں نہیں چاہیئے
گاڈ۔ خدا یا بھگوان" "ہمیں چاہیئے روٹی۔ کپڑا اور مکان" "گو بیک خدا گو بیک"
خدا نے پنڈال سے باہر کر دیکھا تو اس کی نظر ایک جلوس پر پڑی جس کی رہنمائی
کمیونسٹوں کے لیڈر کامریڈ ننگا اور چالاک کر رہے تھے۔ جلوس میں شامل لوگوں کے
ہاتھوں میں کالی جھنڈیاں تھیں۔ خدا کو دیکھ کر انہوں نے کالی جھنڈیاں ہلا ہلا کر
پھر زور شور سے نعرے بلند کرنے شروع کر دیئے "گو بیک خدا گو بیک"
"واپس جاؤ خدا واپس جاؤ" "ہمیں نہیں چاہیئے گاڈ۔ خدا یا بھگوان" "ہمیں چاہیئے

روٹی کپڑا اور مکان" ابھی کمیونسٹوں کے اس جلوس کے نعرے مدھم نہیں ہوئے تھے کہ ان کے جلوس کے پیچھے اکالی سکھوں کا ایک جلوس آ پہنچا۔ وہ یہ نعرہ لگا رہا تھا۔" "چاہے ہو جائے خون خرابہ" "لے کے رہیں گے پنجابی صوبہ" "چاہے ہو جائے خون خرابہ لے کے رہیں گے پنجابی صوبہ"۔

ان دونوں جلوسوں کے مل جانے سے فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ ہر طرف شور اور غل غپاڑہ مچ گیا۔ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ جلوس والوں نے پنڈال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو زبردستی گھسیٹ گھسیٹ کر باہر نکالنا شروع کر دیا۔ اداسی اور افراتفری کے عالم میں خدا کا دربار برخاست ہو گیا۔

جب خدا کار میں بیٹھ کر جلسہ گاہ سے جانے لگا تو جلوس کے آدمیوں نے کار کے آگے کھڑے ہو کر اسے روک دیا اور خدا کو گھسیٹ کر کار سے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس پر خدا کے حامیوں اور اس کے مخالفوں میں ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی۔ اب پھر کیا تھا تمام گراؤنڈ میں ایک زبردست فساد شروع ہو گیا۔ مخالفین نے گھونسوں اور ڈنڈوں سے ایک دوسرے کی مرمت کرنی شروع کر دی۔ جلوس کے مخالفین نے کالی جھنڈیوں کو پھاڑ دیا اور جلوس والوں نے پنڈال میں پڑے ہوئے صوفوں ... اور دریوں کو آگ لگا دی۔ لاؤڈ سپیکر توڑ پھاڑ دیئے گئے۔ اسی دوران میں خدا مخالفین کے ہتھے چڑھ گیا۔ خدا کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے۔ تھپڑوں گھونسوں اور ٹھڈوں سے اس کی تواضع کی گئی۔ ایک منچلے تو اس کے منہ پر سیاہی بھی پوت دی۔ خدا بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگا اور یہ شعر کہتا ہوا آسمان کو

واپس چلا گیا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن

بہت بے آبرو ہو کر بدلا اپنی جنت سے نکلے

دوسرے دن ایک سرکاری پریس نوٹ میں بتایا گیا کہ کل کے فساد میں کل دو ہزار چار سو چھیانوے (۲۴۹۶) افراد زخمی ہوئے۔ دو ہزار ایک سو چھیانوے کو تو معمولی چوٹیں آئی تھیں اس لیے ان کی مرہم پٹی کر کے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ باقی تین سو آدمیوں کے سخت چوٹیں آئی تھیں اس لیے انہیں مختلف ہسپتالوں میں داخل کر دیا گیا ہے۔ کسی شخص کی موت کی اطلاع نہیں ملی ہے۔ مالی نقصان کا اندازہ تیس ہزار روپے کے قریب لگایا گیا ہے۔ شہر میں دفعہ ایک سو چوالیس (۱۴۴) لگا دی گئی ہے۔ مسلح پولیس اور ملٹری کی بکتر بند گاڑیاں شہر میں گشت لگا رہی ہیں۔

لیڈروں نے شہر میں گھوم پھر کر لوگوں کو پر امن رہنے کی تلقین کی۔ کمیونسٹ لیڈروں نے ہوم منسٹر کو ایک خط لکھا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ خدا کو ملک کے اندرونی نظام میں کھلبلی ڈالنے کے جرم میں گرفتار کر کے اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔ کیونکہ نہ وہ ہندوستان میں آتا اور نہ ہی یہ فساد ہوتا۔

جب خدا واپس گیا چہرہ تھا اس کا داغدار

جسم پر تھے زخم اس کے اور دامن تار تار

جھٹ پٹ پبلشنگ ہاؤس

ایڈی چوٹی کا زور لگا کر ناول لکھنے کے بعد سب سے بڑی زحمت جو ہمیں اٹھانی پڑی وہ کسی اچھے اور قابلِ اعتبار ناشر اور پبلشرز کو تلاش کرنے کی تھی۔ ایسے پبلشر کو تلاش کرنا ناول کے پلاٹ کو ڈھونڈنے سے بھی زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ جب ہم کسی کے پاس گئے اس نے نہایت انکساری کے ساتھ ہمارے ناول کو چھاپنے سے معذرت کا اظہار کر دیا۔ جب ایک ایک نے تو اس قدر جب کر تو ہر ادا حوصلہ شکن جواب دیا کہ ہمیں واقعی اس بات کا احساس ہونے لگا کہ جتنا عرصہ ہم نے ناول لکھنے میں برباد کیا ہے اگر اس کی بجائے ہم ملین سگریٹ کی دکان کھول لیتے یا گول گپوں کا خوانچہ ہی لگا لیتے۔ تو یقیناً فائدے میں رہتے۔

سب سے پہلے ہم "سنسنی خیز کتاب گھر" والوں کے ہاں گئے تاکہ اُن کے
مطبع سے اپنے ناول کو چھپوانے کا انتظام کر سکیں۔ مگر ان کے منیجر صاحب
نہایت ہی ملائم الفاظ میں اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے فرمانے لگے "دیکھئے جناب
ہم صرف جاسوسی، سراغ رسانوں کی معرکہ خیز کارگزاریوں کی سرگزشتیں وغیرہ ہی چھاپتے ہیں۔ کم از کم
گھٹیا ادب سمجھ کر ہی نگاہوں میں ہیچ ہے۔ شاید آپ نے ہمارا سائن بورڈ نہیں پڑھا ورنہ آپ کو یہ زحمت
ہرگز نہ اٹھانی پڑتی۔ بہر حال میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔" یہ الفاظ
سُن کر ہم بھی منیجر صاحب کا شکریہ ادا کئے بنا ہی دکان سے باہر آ گئے۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ہم "ادبِ نو پبلشرز" والوں کے یہاں جا دھمکے۔
ان کا دفتر نہایت شاندار تھا۔ دیواروں میں بنی ہوئی صاف و شفاف شیشے کی
الماریوں میں سے نہایت دلفریب اور رنگین گردپوش والی کتابیں باہر جھانک رہی تھیں۔
منیجر صاحب ہمیں دیکھتے ہی بول اٹھے "آئیے آئیے! تشریف رکھئے" اور مصافحہ
کرنے کے لئے ایسی تیزی سے ہماری طرف بڑھے جیسے کوئی سدھایا ہوا کتا گیند
کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اپنا منہ کھولے ہوئے اُسے پکڑنے کو لپک پڑتا ہے۔
ہم مصافحہ کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ منیجر
صاحب نے ہونٹوں پر ایک کاروباری مسکراہٹ لاتے ہوئے فرمایا۔ "بڑی خوشی
کی بات ہے بہت اچھا کیا آپ نے۔ ہاں تو کیا اس سے پہلے بھی آپ کی کوئی کتاب
چھپ چکی ہے؟"

"جی نہیں" ہم نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ ہماری پہلی ادبی کاوش ہے!"
"بہت خوب۔ بہت خوب ماشاءاللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ" یہ آپ نے

بہت اچھا کیا کہ آپ اپنی کتاب چھپوانے کے لئے ہمارے پاس چلے آئے ہم اپنے لکھنے والوں کو اُن کی تصنیفات کا پورا پورا معاوضہ دیتے ہیں۔ دوسرے پبلشروں کی طرح کسی کا حق نہیں دباتے۔ اسی لئے ہم نے اپنے کتاب گھر کا نشان ترازو رکھا ہوا ہے۔ جو کہ انصاف اور مساوات کا عین مظہر ہے۔"

جی ہاں میں نے آپ کے ادارے کی وضع داری کی تو دھوم مچی ہوئی ہے۔ اگر آپ کے بلند پایہ ناشر خانہ سے میری کتاب چھپ جائے تو میں اپنے آپ کو نہایت خوش قسمت سمجھوں گا۔ ہم نے بھی تجارتی اندازِ گفتگو اختیار کرتے ہوئے فرمایا۔

تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد منیجر صاحب نے کتاب کا مسودہ ہمارے ہاتھ سے لیا اور چہرے کو نہایت سنجیدہ بنا کر اُسے ترازو میں تولنے لگے۔ ہم مجسمہ حیرت بنے ہوئے اس کاروائی کو دیکھتے رہے

"ایک سیر اڑھائی چھٹانک کے قریب ہے آپ کا ناول"۔ منیجر صاحب نے ترازو پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے ہمیں اطلاع دی۔

کیا مطلب؟ ہم نے ذرا چونک کر پوچھا۔ خدا کی قسم ہم نے ساری زندگی میں ایسا حیرت انگیز سوال کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"بہت بھولے ہیں آپ بھی"۔ منیجر صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "مطلب یہ ہے کہ ہم کتابیں تول کر لیتے ہیں۔"

ہمارے دل میں امید کی کرن ایک دفعہ پھر چمک اٹھی۔ ہم نے سوچا کہ اگر یہ مسودے کو پڑھنے کی بجائے تول کر لیتے ہیں۔ تو ضرور ہزار بارہ سو روپے ہمیں بھی ملنے ہونگے دل ہی دل میں ہم اپنی سوچ پر شرمندہ ہو گئے۔ اور پوچھنے پر آگیا

خشک سی ہنسی لا کر دریافت کیا "گستاخی معاف میں سمجھا نہیں تھا۔"

"کوئی بات نہیں، نہ کوئی بات نہیں" منیجر صاحب نے ذرا تسکین آمیز لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"اچھے لکھنے والے ادیبوں کو تو ہم چالیس سے لے کر پچاس روپے سیر تک خرید لیتے ہیں۔ چونکہ آپ ابھی نئے نئے لکھنے والے ہیں۔ اس لئے فی الحال آپ کو بیس روپے سیر کے مل جائیں گے"

ابھی ڈیڑھ سال کی دماغ سوزی کو اتنا ارزاں جاتا دیکھ کر ہمارا خون کھول اٹھا۔ جی میں آ رہا تھا کہ میز پر پڑے ہوئے ترازو کو اٹھا کر منیجر صاحب کے سر پہ دے ماریں۔ مگر موقع و محل کی مصلحتوں کو دیکھ کر ہمیں اپنے اس ارادے کو ملتوی ہی کرنا پڑا۔ ہم نے خون کا گھونٹ پی کر منیجر صاحب سے پوچھا "اجی صاحب۔ مذاق کیوں کرتے ہیں کچھ کام کی بات کیجئے۔"

"یہ مذاق کی بھی آپ نے خوب کہی۔ میں مذاق میں کرتا ہوں یا آپ۔ بیس روپے سیر تو میں نے آپ کا دل رکھنے کے لئے کہہ دیا ہے۔ ورنہ نئے لکھنے والوں کو تو میں پندرہ روپیہ فی سیر سے زیادہ کبھی دیتا ہی نہیں ...... کہیے تو دس بیس تیس روپے دے کے ایک سیر اڑھائی چھٹانک لکھ سکے ہو؟"

ہم منیجر صاحب کے سامنے بیٹھے ہوئے دل ہی دل میں سٹپٹا رہے تھے۔ ارادہ تو کچھ اور ہی تھا مگر فوجداری چل جانے کے ڈر سے ہم صبر کر گئے۔ ضبط سے باہر تھے۔ طبیعت کافی پریشان ہو چکی تھی۔ اس لئے کسی اور پبلشر سے ملنے کی بجائے ہم سیدھے گھر واپس آ گئے۔

دوسرے دن ہم نئے ولولوں اور نئی امنگوں سے مسلح ہو کر گھر سے نکلے اور "مکتبہ ترقی پسند" کے ناظم سے ملے۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ صرف ترقی پسند لٹریچر ہی شائع کرتے ہیں۔ جب ہم نے انہیں یقین دلایا کہ ہمارا ناول سو فیصدی ترقی پسند ہے تو انہوں نے مسودے کو لے کر رکھ لیا اور فرمایا کہ آٹھ دن کے بعد وہ مسودے کو پڑھ کر اپنی رائے دیں گے۔ جوں توں کر کے ہم نے آٹھ دن بھی گزار ہی دیے۔ جب آٹھ دن بعد ان کا فیصلہ معلوم کرنے کے لیے گئے تو انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی مسودہ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور فرمانے لگے۔ ساتھی! آپ کا ناول ہرگز ترقی پسند نہیں ہے۔ نہ تو اس میں مزدور اور [illegible] کی کشمکش ہی دکھائی گئی ہے۔ اور نہ ہی کسانوں کی تحریک کا کوئی ذکر کیا گیا ہے۔ ہڑتالوں، مظاہروں، لاٹھیوں اور گولیوں کا ذکر تو آپ نے بھول کر بھی نہیں کیا۔ ترقی پسندی تو آپ کے ناول میں خوردبین سے دیکھنے پر بھی دکھائی نہیں دیتی۔"

معاف کیجئے گا" ہم نے کامریڈ صاحب کو جواب دیتے ہوئے کہا "صرف سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش کی جذباتی عکاسی کرنے کا نام ترقی پسندی نہیں ہے ہمیں پیٹ کی بھوک کے علاوہ انسان کی اخلاقی اور روحانی بھوک کو بھی مٹانا ہے ہم صرف روٹی کھانے کے لیے ہی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ قدرت ہم سے بہت کچھ چاہتی ہے۔"

"چلیے آپ کا یہ نظریہ درست ہی سہی" کامریڈ صاحب بولے "لیکن آپ کے ناول میں ایک اور زبردست [illegible] ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے ناول میں ہم

نے لفظ "سُرخ" کو ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کی ظاہر کی آنکھیں چھوڑ کر باطن کی آنکھوں سے بھی دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر افسوس ہماری یہ حسرت (لفظ سُرخ کو ڈھونڈ نکالنے کی) دل ہی دل میں رہ گئی۔ اب آپ سے کیا! ناول کو ترقی پسند کہیں تو کیسے؟ البتہ ناول کا اکسیرے نہیں کیا گیا۔ شاید ایسا کرنے سے کہیں ترقی پسندی کا بھی پتہ چل جائے۔"

"اکسیرے چھوڑ چاہے آپ میرے ناول کا پوسٹ مارٹم کر جائیں۔ جب تک آپ کی آنکھوں پر "سُرخ پٹی" بندھی ہوئی ہے آپ کو ترقی پسندی کہیں بھی نظر نہیں آسکتی۔" یہ کہہ کر ہم نے کامریڈ صاحب کو "جے ماسکو" کہی اور مسودے کو بغل میں دبا کر باہر آگئے۔

اس کے بعد ہم نے "آہ پبلشنگ ہاؤس" والوں سے قسمت آزمائی کی ٹھانی اور ان کے دفتر میں جا پہنچے۔ ایک سن رسیدہ بزرگ نے مری ہوئی آواز میں ہمارا استقبال کیا۔ انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سارا فرنیچر سیاہ رنگ کا تھا۔ میز پوش اور فائلیں بھی کالے رنگ کی تھیں۔ کتابوں کے گرد پوش بھی اسی رنگ کے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہم کسی ادب کدے کی بجائے کسی ماتم کدے میں داخل ہو گئے ہیں۔ سارے کمرے میں حسرت و یاس کا ماحول طاری تھا۔ خیر ہم نے ان بزرگ صاحب سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ سب سے پہلا سوال جو انہوں نے پوچھا وہ یہ تھا۔

"آپ کا ناول کامیڈی ہے یا ٹریجیڈی؟"

"کامیڈی"

"کامیڈی!"

لفظ کامیڈی سنتے ہی انہوں نے کچھ اس طرح رُوانسا منہ بنایا جیسے ہم نے انہیں کوئی گالی دے دی ہو جھینپ کے وہ ہماری طرف اس طرح دیکھتے رہے جیسے ہم نے ان کے لطیف جذبات کو بہت بڑی ٹھیس لگا دی ہو۔ ذرا تامل سے کچھ لمحہ خود بولے۔ "معاف کیجئے صاحب۔ ہم آپ کا ناول شائع نہیں کر سکتے۔"

"یہ آپ نے کس طرح کہہ دیا۔ ابھی تک ناول تو آپ نے پڑھا ہی نہیں۔"

ہم نے احتجاج کیا۔

"اب پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی برخوردار۔ آپ نے کامیڈی لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ابھی تک آپ کو دنیا کا کچھ تجربہ نہیں ہے۔ دنیا میں کامیڈی یعنی خوشی ہے کہاں؟ یہاں تو فقط ٹریجیڈی ہی ٹریجیڈی ہے۔ یہ دنیا تو دُکھوں کا گھر ہے۔ یہاں انسانوں کو طرح طرح کے دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ ایک تو خدا نت نئے مظالم ایجاد کرتا ہے دوسرے انسان انسان کا گلا گھونٹتے ہیں۔ دوسروں کا حق چھینتے ہیں۔ غرضیکہ ہر طرف فریب۔ مکر اور ریاکاری کا دور دورہ ہے تمام ماحول غمگین اور اداس ہے ساری فضا آنسوؤں۔ آہوں۔ سسکیوں اور چیخوں سے بوجھل ہو رہی ہے۔ مگر آپ پوچھ بھی تو کامیڈی لکھ رہے ہیں۔ پتہ نہیں کب آپ لوگوں کا شعور پختہ ہوگا جب آپ حقیقت کا احساس کریں گے"

اس وقت ان کی آواز بھرائی تھی اور قریب ہی تھا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگ پڑتے۔

تھوڑی دیر کے لئے تو ہمیں بھی یہی خیال ہو گیا کہ واقعی ہم نے کامیڈی

لکھ کر بہت بڑی غلطی کی ہے ۔ بہت بڑا گناہ کیا ہے ۔ ہم نے ایک سرد آہ بھر کر
کریہہ کیا ۔ ۔ دیوار کی طرف دیکھا اس پر کچھ اس قسم کے ماٹو لٹکے ہوئے تھے
" موت کو مت بھولو ۔ " " دنیا دکھوں کا گھر ہے " " اصلی سکون موت کی آغوش
میں ملتا ہے " اور ان سب سے شاندار ماٹو یہ تھا " زندگی کے معنی ہیں
رونا اور چلانا ۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو خود روتا ہے اور جب مرتا ہے
تو دوسروں کو رلاتا ہے "

ہم نے ان بزرگ حضرت سے اپنی اس غلطی (کامیڈی لکھنے) کی اسی لئے معافی
مانگی اور واپس آ گئے ۔ آج طبیعت پھر کافی پریشان ہو گئی تھی ۔ اب معلوم ہو رہا
تھا جیسے یہ دنیا واقعی ایک بہت بڑا ماتم کدہ ہے ۔ اور یہاں تمام انسان
ایک دوسرے کا ماتم کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں ۔ مگر یہ خیالات دوسرے
دن رفو چکر ہو گئے ۔ کیونکہ یہ تصویر کا ایک ہی رخ دکھا رہے تھے ۔ اس دن ہم
پھر ایک نئے ناشر خانہ " حسینہ پٹ پبلشنگ ہاؤس " گئے ۔ مالک کے دفتر میں
داخل ہونے کی دیر تھی کہ نوجوان پروپرائٹر نے تیزی سے مصافحہ کرنے کے بعد
جلدی سے پوچھا " فرمائیے کیسے آنا ہوا ؟ "

" ایک ناول لکھا ہے "

" دکھائیے ۔ " نوجوان پروپرائٹر نے جلدی سے مسودہ کو ہاتھ میں لیا اور
ہاتھ ہی ہاتھ میں اس کے وزن کا اندازہ کیا ۔ دو چار صفحے الٹے اور پھر مسودے
کو سونگھنے لگا ۔

کیا سونگھ رہے ہیں ؟ " ہم نے حیران ہو کر پوچھا ۔ نوجوان پروپرائیٹر

نے جواب دیا "یوں تو میں عمر میں چھوٹا ہوں مگر اس لائن میں میرا تجربہ بہت وسیع ہے۔
میں کتاب کو سونگھ کر ہی اندازہ لگا لیتا ہوں کہ وہ کیسی ہے"۔

"واہ بہت خوب!! ہم نے اس کے تجربے کی داد دی۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں" ـ نوجوان بولا۔ اب آپ داد دینے میں مزید وقت
ضائع کئے بغیر ناول کے معاوضہ کا فیصلہ کر لیں۔ کیونکہ ہمارا اصول ہے کہ ہم جو
کام بھی کرتے ہیں۔ جلدی سے جلدی کرتے ہیں۔ اسی لئے ہم نے اپنے ناشر خانہ کا نام
جھٹ پٹ پبلشنگ ہاؤس رکھا ہوا ہے۔

"صاحب آپ ہی بتا دیجئے۔ آپ بھلا کم تھوڑا دیں گے۔ آپ......"
"دیکھئے آپ پھر اس اب آپ کے تکلفات میں پڑ گئے۔ جو کام بھی کرنا ہو اسے
جھٹ پٹ کر لیجئے۔ ملوئے آپکو پچاس روپے منظور ہیں"۔

"یہ تو بہت تھوڑے ہیں۔ سیکھنے ناول نے ڈیڑھ سال لگا کر......"
"معاف کیجئے گا۔ آپ کے ساتھ ہمارا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ آپ تشریف
لے جا سکتے ہیں" نوجوان بیزاری سے بولا۔

آخر ہمیں پچاس روپے ہی منظور کر لینے پڑے۔ نوجوان پروپرائیٹر نے دوسرے
ہی لمحے ایگریمنٹ پر دستخط کروائے اور جھٹ سے دس دس کے پانچ نوٹ
ہمیں دے دیئے۔ یہ سارا سودا آنکھ جھپکتے میں طے ہو گیا۔ واقعی جھٹ
پٹ پبلشنگ ہاؤس والے کام کرنے میں بڑے تیز نکلے۔

ہم گھر واپس آتے ہوئے پچاس روپے کے اس قدر نا معاوضہ کی بابت
سوچ رہے تھے۔ ہمیں یہ شک ہو رہا تھا کہ شاید کتاب کو سونگھنے والا تو محض بزرگ!

لکھتے ہیں۔ ادب نقصان کا سائیڈ بزنس ہے۔ وہ ضرور کہیں نہ کہیں نقب لگا کر یا ڈاکہ ڈال کر اپنا گزارہ کرتے ہوں گے!..

اشتہاری خریداری

میں کسی شخص کے عقل مند یا بیوقوف ہونے کا اندازہ صرف ایک سوال پوچھ کر ہی لگا سکتا ہوں۔ میرا یہ سوال ایک ایسی کسوٹی ہے جس نے مجھے آج تک ایک دفعہ بھی دھوکا نہیں دیا۔ لیجیے اس پُر اسرار سوال کو آپ بھی سنیے اور آج ہی اپنے دوستوں۔ واقف کاروں اور ملنے والوں کی عقل کا امتحان لیجیے۔ جس کسی شخص کو آزمانا مقصود ہو۔ اُس سے یہ سوال پوچھیے: "کیوں صاحب۔ کیا آپ اخباروں۔ رسالوں۔ ڈائریوں اور جنتریوں وغیرہ میں مشتہر شدہ چیزوں کو خریدتے ہیں؟" اگر وہ "نفی" میں جواب دے تب تو اُس کا دماغ صحیح سمجھیے اور اگر وہ "ہاں" میں جواب دے تو آپ مزید پوچھ تاچھ کیے بغیر ہی اُسے ٹکسالی بیوقوف

ہونے کا فتنہ لے ڈوبے۔ سمجھیے۔ میرا یہ سوال کوئی الہامیہ نہیں بلکہ یہ میرے اُس تجربے کا نتیجہ ہے جو میں نے ہزاروں روپے برباد کر کے سیکھا ہے۔ ثبوت کے طور پر میں اپنی لٹھ ڈیک ([illegible]) بیوقوفی کی چند روشن مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔

پہلا واقعہ تو میری عمر کے اُس حصے سے تعلق رکھتا ہے جسے لوگ اُٹھتی جوانی کے نام سے پکارتے ہیں۔ نئی نئی جوانی تھی اس وقت جنسی جذبات کو بھڑکانے والے ناول اور فلمیں جلتی پر تیل چھڑکتی تھیں ہر ایک فلم میں ہیرو اور ہیروئن کے درمیان محبت کے دلچسپ کھیل کو دیکھ کر میرا دل بھی بے اختیار یہی چاہتا تھا کہ اگر زیادہ نہیں تو کم از کم ایک لڑکی تو ایسی ملنی چاہیے جسے میری محبوبہ ہونے کا فخر حاصل ہو۔ فلمی ہیرو کی طرح میں نے بھی کئی لڑکیوں کے آگے جان بوجھ کر اپنے رومال گرائے یا ان سے ٹکرا کر ان کی کتابیں زمین پر گرائیں۔ مگر افسوس نہ تو کسی لڑکی نے مجھے رومال ہی اُٹھا کر دیا اور نہ ہی مجھ سے کتابیں اُٹھوا کر واپس لینے کے بعد محبت بھری نظروں سے دیکھ کر "تھینک یو" ہی کہا۔ اُلٹا کئی لڑکیوں نے قہر آلود نظروں سے گھور کر سینڈلوں سے خاطر تواضع کرنے کا اشارہ ضرور کیا۔ کئی دفعہ قصداً اپنی سائیکل اُن کی سائیکلوں سے ٹکرائی مگر کچھ بھی ہاتھ پلے نہ پڑا۔ اب تو صرف ایک ہی فلمی طریقہ آزمانے کے لئے باقی رہ گیا تھا۔ وہ یہ کہ کسی حسینہ کو کار میں آتا ہوا دیکھ کر اس کی کار کے نیچے آ جاؤں تاکہ وہ مجھے اُٹھا کر اپنے گھر لے جائے اور اپنی قمیص ساڑھی یا دوپٹے کا ایک کنارا پھاڑ کر میرے سر پر مرہم پٹی کرے اور میری بیہوشی دور ہونے کے وقت تک نہایت ہی بیقراری سے

گھٹ کی پتنگے وکم کی طرح میرے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ چونکہ یہ طریقہ خلاف تھا اس لئے اس پر عمل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ جب میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ایک رسالے میں مندرجہ ذیل اشتہار پر نظر پڑی۔ مہربانی اس کو نہ پڑھیں۔ اگر پڑھیں تو فائدہ اٹھائیں۔

منموہنی سینٹ

عاشقوں کیلئے ایک نادر تحفہ

قارئین۔ اگر آپ محبت میں چاروں طرف سے مایوس ہو چکے ہیں اور کوئی امید بر نہیں آتی "جیسے حالات سے تنگ آکر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں تو مرنے سے پہلے ہمارے لاجواب اور کراماتی "منموہنی سینٹ" کو ضرور آزمایئے ہمارا یہ سینٹ کوئی بناوٹی عطر نہیں بلکہ ہمارے بزرگوں کی سالہا جذبات کا نتیجہ ہے جو انہوں نے ایک پہنچے ہوئے سنیاسی کی بتیس سالہ قریب سینٹ کی مدہوش کرنے والی خوشبو کو سونگھتے ہی آپ کا محبوب آپ سے ملنے کیلئے ماہی بے آب کی طرح بیقرار ہو کر سر کے بل آپ کے قدموں میں حاضر ہو جائے گا۔ ایک شیشی کی اصل قیمت ایک سو روپیہ ہے لیکن مشہوری کیلئے اس رعایت کا جلد از جلد فائدہ اٹھایئے تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے"

یہ اشتہار پڑھتے ہی میری باچھیں کھل گئیں۔ فوراً ڈاکخانے پہنچ کر دس روپے کا منی آرڈر کروایا اور نہایت ہی بے قراری سے منموہنی سینٹ کے پارسل کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جب تک یہ کراماتی سینٹ نہ آیا میں

دل ہی دل میں کئی قسم کے خیالی پلاؤ پکاتا رہا۔ کبھی یہ سوچتا کہ پہلے پہل تو یہ سینٹ سونگھ کر اُن لڑکیوں سے جی بھر کر بدلہ لوں گا جو اس وقت اپنے حُسن کے زعم میں میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں یا اگر غلطی سے دیکھ بھی لیں تو ایسا مُنہ بناتی ہیں جیسے انہیں ابھی ابھی چھینک آنے ہی والی ہے۔ جب وہ اس عجیب و غریب سینٹ کی خوشبو سے بیتاب ہو کر میرے قدموں میں حاضر ہوں گی تو میں انہیں نہایت ہی نفرت سے ٹھوکر مار کر کہہ دوں گا "چلی جاؤ یہاں سے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہارے جیسی آوارہ لڑکیوں کی بات سن سکوں"۔ اور کبھی میں یہ سوچتا کہ سیدھا بمبئی چلا جاؤں گا اور وہاں اپنی دل پسند ایکٹرسوں کو یہ سینٹ سونگھا کر اپنا شیدائی بنا لوں گا۔ خوب مزے میں زندگی گزرے گی۔ اگر مدھو بالا میرے پاؤں دبایا کرے گی تو نرگس میرے دل کی آگ کو بجھانے کے لئے نہایت ہی دلفریب انداز میں پنکھا کیا کرے گی۔ اگر شکیلا مجھے پریم کے جھولے جھلایا کرے گی تو آشا پاریکھ اپنی کیف آور نگاہوں کی مستی سے سرور کر کے مجھے بے خودی کے افسانے سنایا کرے گی۔ وجینتی مالا اپنے دلکش ناچ سے اور لتا اپنی مسحور کن آواز سے مجھے محظوظ کیا کرے گی۔

آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا مجھے بڑی شدت سے انتظار تھا۔ ڈاکیہ آیا اور جو وہ آتے ہی ڈاک خرچ لے کر منموہنی سینٹ کا پارسل میرے ہاتھوں میں تھما کر رخصت ہو گیا۔ میں نے جلدی سے پارسل کھولا اور منموہنی سینٹ کی خوشنما شیشی کو ہاتھ میں لے کر اُسے جوشِ عقیدت سے چوم لیا۔ منموہنی سینٹ کو پا کر میں اتنا خوش ہو رہا تھا۔ جیسے میرے ہاتھ سینٹ کی شیشی نہیں بلکہ

البتہ ذہن کا چراغ اکیلا ہے۔ میں نے بہت سے نیا سوٹ پہنا اور اُس پر اسرار سینٹ کو رومال اور کوٹ کے کالر پر چھڑک کر فوراً کسی معشوق کی تلاش میں بازار کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ خوش قسمتی سے جلد ہی ایک ایسی لڑکی مل گئی جو کہ ایک عرصے سے میرے خوابوں میں بسی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میں نے جلدی سے رومال کو جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تاکہ اگر وہ کوٹ کے کالر سے منموہن سینٹ کی خوشبو کو نہ سونگھ سکے تو میں اپنے رومال کو اُس کی ناک کے نزدیک لے جا کر اُسے سونگھا دوں۔ جب وہ میرے نزدیک پہنچ گئی تو میں بھی اُس کے راستے قریب سے گزرا کہ اُس کا شانہ میرے شانے سے ٹکرا گیا۔ میں رومال کو بھی اُس کی ناک کے نزدیک اس صفائی سے لے گیا کہ اگر وہ اس واقعہ پر غور بھی کرتی تو یہی سمجھتی کہ اس سے میرا شانہ ٹکرانے پر گھبراہٹ کی حالت میں یہ حرکت مجھ سے سرزد ہو گئی ہے۔ رومال کو اپنی ناک سے لگا کر گزرتے ہی اُس نے ایک جھرجھری سی لی اور بے اختیار گرج کر بولی "یہ کیا بیہودگی ہے۔ اندھے ہو گئے ہو کیا۔ دیکھ کر نہیں چلا جاتا" بازار میں کچھ [illegible] پر بے عزتی ہو جانے کے ڈر کی بابت سوچ کر میں نے چپکے سے اُس سے معافی مانگی اور تھوڑی دور آگے نکل کر ایک غیر آبادی سی گلی کے موڑ پر کھڑا ہو کر اُس کے آنے کا انتظار کرنے لگا کیونکہ سینٹ تو اُس نے اچھی طرح سے سونگھ ہی لیا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر میں اُس کی راہ دیکھتا رہا لیکن وہ میرے پاس نہ پھٹکی۔ جب اُس کا انتظار کرتے ہوئے چالیس پینتالیس منٹ گزر گئے تو اچانک ساتھ والے مکان کی دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں سے ایک شخص نے باہر جھانک کر مجھ سے یوں کہا "اتنی دیر سے یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ کیا کسی کا تالا توڑنے کا ارادہ ہے۔ بھاگ جاؤ"

یہاں سے دور تھی ابھی نیچے اُتر کر تمہاری خبر لیتا ہوں"۔ یہ سُن کر میں بہت کھسیانہ ہوا اور چپکے سے گھر واپس آگیا۔ کافی دیر تک یہ سوچتا رہا کہ وہ لڑکی میرے پاس کیوں نہیں آئی حالانکہ میں نے اُسے سینٹ اچھی طرح سے سُونگھا دیا تھا۔ پھر یہ خیال آیا شاید یہ سینٹ کچھ کم لگا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے منموہنی سینٹ کی پوری شیشی اپنے کپڑوں پر اُنڈیل لی اور دوبارہ کسی نئے شکار کی تلاش میں گھر سے باہر نکل پڑا۔ سینٹ کی خوشبو اتنی تیز تھی کہ میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ بار بار کئی لڑکیوں کے آگے پیچھے منڈلاتا رہا مگر کسی نے بھی میرا نوٹس نہ لیا۔ آخر کار تھک ہار کر منموہنی سینٹ بنانے والوں کو کئی کئی ٹن وزنی گالیاں نکال کر کافی رات گئے گھر پہنچا اور بغیر کچھ کھائے پیئے ہی سو گیا۔ دوسرے دن مجھے کافی زور کا زکام ہو گیا (سینٹ کی تیز خوشبو کی وجہ سے) اور کئی دنوں تک میری طبیعت نہایت ہی خراب رہی۔ حسین لڑکیوں اور ایکٹرسوں کے دلوں کی مہا بننے کے رنگین جال کے سنہری دھاگے ایک ایک کر کے بکھر گئے اور میں پہلے کی طرح غمگین اور مایوس رہنے لگا۔

کچھ دنوں کے بعد اخبار میں ایک اور اشتہار پر نظر پڑی جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

محبت کا سُرمہ

اس جادو بھرے محبت کے سُرمہ کو آنکھوں میں ڈال کر محبوب کے سامنے چلے جائیں تو وہ خواہ کیسا ہی پتھر دل کیوں نہ ہو فوراً اُس کا دل موم ہو جائیگا

آپ سے محبت کرے گا۔ آپ کے پاس کچے دھاگے سے بندھی آجائیں گی میری سرکار کو والی کہاوت کے مصداق خود بخود کھنچا چلا آئے گا۔ بے نظیر تحفہ ہے پرچہ ترکیب ہمراہ ہوگا۔ فیض نہ نکلے تو قیمت فوراً واپس ہوگی دو دی پی طلب کریں اس اشتہار نے میرے ڈوبتے ہوئے دل کو ڈھارس دی اور میں نے اس سرمہ کا بھی آرڈر دے دیا۔ سرمہ ملنے پر میں نے ساتھ والے پرچے پر لکھی ہوئی ترکیب کے مطابق ایک منتر پڑھ کر اس کی دو سلائیاں آنکھوں میں ڈالیں اور چھیلا بن کر اسکی کرامات آزمانے کیلئے گھر سے باہر نکل گیا مگر افسوس کوئی لڑکی بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ انہوں نے مجھ پر دل تو کیا نچھاور کرنا تھا الٹا اپنے تیز تیز ہیئر پن والے سینڈل نچھاور کرنے کے خوفناک ارادے ضرور ظاہر کرنے لگیں۔ جب کسی نے بھی مجھے سرمہ ڈالے ہوئے دیکھا وہ بے اختیار ہنسنے لگا کیونکہ اس سے پہلے کسی نے کبھی بھی میری آنکھوں میں سرمہ نہیں دیکھا تھا۔ کچھ دن بعد تنگ آکر میں نے سرمہ کی باقی ماندہ ساری شیشی اپنی آنکھوں میں جھونک لی تاکہ اگر اس میں کوئی کرامات ہو تو فوراً ظاہر ہو جائے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ پورا ایک مہینہ میری آنکھوں پر پٹی بندھی رہی اور میری نظر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کمزور ہو گئی۔ محبت کے اس سرمہ نے میری آرزوؤں کا بھی سرمہ ہی بنا دیا۔

اس کے بعد میں نے شری سوامی گیت نرائن جی لکشمی آشرم والوں کا منہ مانگا وشی کرن جنتر منگوا کر بھی کئی مہینے اپنے دائیں بازو سے باندھ رکھا مگر افسوس کوئی بھی حسینہ میرے سنسان پہلو کی رونق نہ بن سکی۔ میں نے

کافی عرصہ بنگال مسمریزم ہاؤس سے پروفیسر صاحب کی "طلسمی انگوٹھی" بھی اپنے ہاتھ میں پہن رکھی مگر وہ بھی کسی لڑکی کو میرے نزدیک لانے میں کامیاب ثابت نہ ہوئی حالانکہ اس انگوٹھی کی بابت پروفیسر صاحب نے یہاں تک لکھا تھا کہ یہ انگوٹھی جو مسمریزم کے طریقہ پر حال ہی میں ایجاد ہوئی ہے اس کو حسب ہدایت استعمال کرنے سے مردہ روحوں سے ملاقات، گمشدہ چیزوں کا پتہ، دور پردیس میں گئے ہوئے دوستوں اور رشتہ داروں سے بات چیت مقدمہ و امتحان میں کامیابی اور عمدہ نوکری کا ملنا۔ محبوب کو قابو میں کرنا بہت ممکن اور آسان ہو جاتا ہے۔ افسوس کوئی بھی سینٹ۔ سرمہ، تعویذ جنتر اور انگوٹھی وغیرہ میرے دل کی اجڑی دنیا کو آباد نہ کر سکی۔ الٹی اس کی ویرانی تنہائی اور غم اسی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔ اب میں ۔۔۔ محبوب کو بس میں کرنے والی کسی چیز کے متعلق کوئی اشتہار پڑھتا ہوں تو چپکے سے اس کے مشتہر پر لاحول پڑھ کر خاموش ہو جاتا ہوں۔

محبوب کی محبت کی گارنٹی دینے والوں کے بعد میں امریکن پستول والوں کا نشانہ بنا۔ پستول کی بابت انہوں نے لکھا تھا۔ ہمارا پستول آپ کا بہترین محافظ اور مددگار ہے اسے ہاتھ میں لیکر آپ بلاخوف و خطر گھنے سے گھنے جنگلوں میں گھوم پھر سکتے ہیں۔ اس کا دھماکا سن کر خوفناک سے خوفناک جنگلی جانور بھی دم دبا کر بھاگ جاتے تھے۔ چور اور ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے اور دھماکہ کے ڈر کے انہیں ہچکیاں

آف شروع ہو جاتی ہیں۔ سو سمجھا گیا کہ یہ شاید پستول کے لئے گورنمنٹ سے کسی قسم کا لائسنس نہیں لینا پڑتا۔" جب میں نے اُن کا پستول منگوانے کے بعد اُسے آزمانے کے لئے اپنے گھر میں آنے والی شریر بلی پر فائر کیا تو میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ فائر کے دھماکے سے ڈر کر بھاگنے کی بجائے یہ شریر کی ماسی (بلی) اُلٹا مجھے جھاڑ کر۔ خوفزدہ خود کرتی ہوئی مجھ پر حملہ آور ہو گئی۔ دہشت کے مارے پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں نے بھاگ کر اپنے کمرے میں داخل ہونے کے بعد دروازے کو بند کر کے جان بچائی۔ اس واقعہ کے بعد میرا چھوٹا سا بھتیجا اِس خوفناک ہتھیار سے بلا خوف و خطر کھیلتا رہتا ہے۔

امریکن پستول کے بعد پیرس ناولٹی واچ کمپنی والوں نے میری عقل کا مزید امتحان لیا۔ انہوں نے اپنے اشتہار میں لکھا تھا:" اپنی فرم کی مشہوری کی خاطر ہم ایک ہزار گھڑیاں صرف پانچ روپے فی گھڑی کے حساب سے دیں گے۔ ہماری ان گھڑیوں کی خوبصورتی اور پائیداری کی گارنٹی پانچ سال سے ہے۔" جب ان کی گھڑی میرے ہاتھوں میں پہنچی تو میرے دل کی حرکت بند ہوتے ہوتے بھی رہ گئی۔ ان کی یہ گھڑی بازار میں ایک ایک آنے میں بکنے والی بچوں کی گھڑیوں کی مانند کسی قسم کی مشینری کے بغیر ہی تھی۔ ہاں البتہ خوبصورتی اور پائیداری میں وہ ایک آنے والی گھڑی سے کہیں زیادہ دیدہ زیب اور مضبوط تھی۔ "پیرس ناولٹی واچ کمپنی" والے زبان کے سچے نکلے۔

میری معصومیت اور سادہ لوحی کی داد دیجئے کہ پستول اور

گھڑی کی خریداری کے بعد بھی میں اخباری اشتہار بازوں کی رنگا رنگ دلفریب اور عقل کو زنگ لگا دینے والی عبارتیں پڑھ پڑھ کر کئی قسم کے کیمرے، دھوپ کی عینکیں اور فاؤنٹین پین وغیرہ خریدتا رہا۔ جب یہ لٹیرے جی بھر کے مجھے اُلّو بنا چکے تو مجھے بھی عقل آ گئی۔ واقعی انسان تجربے کے بعد ہی کچھ سیکھتا ہے اسی تجربے نے ہی مجھے کسی کی عقل کا امتحان لینے کے لئے یہ سوال پوچھنے کے قابل بنایا ہے کہ کیوں صاحب! کیا آپ اخباروں، رسالوں، جنتریوں اور ڈائریوں وغیرہ میں مشتہر شدہ چیزوں کو خریدتے ہیں؟

ایک ہندوستانی مہاراجہ کے نام کھلا خط

بخدمت حضور فیض گنجور ہز ہائی نس مہاراجہ گرنودہ صاحب بہادر جی۔ او۔ اے

سی۔ ایس۔ آئی۔ آر جی ڈبلیو ڈی سی ٹی۔ بی ڈی سی۔ ڈی ٹی وغیرہ وغیرہ۔

بندہ نہایت ہی ادب سے فرشی سلام بجا لانے کے بعد عرض کرتا ہے کہ خدا آپ کے اقبال کے ڈھلتے ہوئے سورج کو ہندوستان میں دوبارہ پھیلانے پر پھیلی ہوئی بیکاری اور دہشت ستانی کی طرح دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔ کل اخبار میں پڑھا تھا کہ اپنے ملک کو آزادی ملنے کے بعد آپ کے پنشنوں کی طبیعت کئی دیگر مہاراجوں کی طرح ناساز رہتی ہے اور آپ بھی صحت کی خاطر سوئٹزرلینڈ میں مقیم ہیں۔ یہ آپ نے بہت ہی اچھا کیا جو اپنی گرتی ہوئی صحت کو بنانے کی خاطر ملک سے باہر تشریف لے گئے کیونکہ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان کی آب و ہوا میں چند ایک ایسے خطرناک جراثیم پیدا ہو چکے ہیں جو آپ ایسے شاہانہ اور نازک مزاج لوگوں

کی طبیعت کے لئے نہایت ہی نقصان دہ ہیں۔ مطلب یہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ انگریزوں
کے جانے کے بعد آپ کی رنگین طبع کے لئے کوئی موزوں سوسائٹی ہی نہیں ہے
۔ انگریزی راج کی بہاریں ہی اور تھیں۔ راگ رنگ کی محفلیں۔ کاک ٹیل پارٹیاں
شکار اور سیر و تفریح کے پروگرام تو اب ایک خواب بن کے رہ گئے ہیں۔ شاہی وقار
اور رعب داب سے عوام اب بالکل مرعوب نہیں ہوتے۔ کیونکہ چند سرپھرے
لیڈروں نے کہیں سے اُن کے دماغ میں یہ غلط اور لغو خیال ٹھونس دیا ہے
کہ رجواڑوں اور عوام کے درمیان حیثیت کے لحاظ سے اب کوئی بنیادی فرق
نہیں ہونا چاہیے۔ حکمرانوں اور رعایا کے درمیان صدیوں کا پرانا رشتہ
توڑ کر سب کو یکساں شہری حقوق ملنے چاہییں۔ گستاخی معاف لوگ تو یہاں
تک کہتے ہیں کہ حکومت کو آپ کی تمام جاگیریں چھین لینی چاہییں۔ اور تو اور آپ
کا پریوی پرس اور دیگر الاؤنس و مراعات بھی بند کر دینی چاہیئے۔ خدا کی
پناہ۔ وہ تو آپ کو سفید ہاتھی کہنے سے بھی نہیں جھجکتے۔ لاحول ولا قوۃ
کیسا الٹا زمانہ آگیا ہے۔ خیر کہنے دو جی ان لوگوں کو۔ جب تک موجودہ حکومت
برسرِ اقتدار ہے آپ کو ایسے گھٹیا لوگوں کے بیکار نعروں کی ذرا پرواہ نہیں
کرنی چاہیئے۔ پتہ نہیں یہ کس قماش کے لوگ ہیں کہ آپ سے حکومت
کے اختیارات چھین کر بھی ان کی نیت نہیں بھری جو اب یہ آپ کی جاگیروں، محلوں
اور دیگر الاؤنسوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ کسی نے سچ
ہی کہا ہے کہ لالچی آدمی سے خدا بچائے۔

یور ہائی نس۔ اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک عرض کروں۔ کیوں نہیں آپ

اپنی جاگیروں - محلوں اور دیگر ساز و سامان کو فروخت کر کے مستقل طور پر یورپ یا امریکہ میں بس جاتے ..... اگر آپ ہندوستان میں رہیں گے - تو ہندو جب بالا نشین ہوں گے نعروں کی گونج آپ کے کانوں کے نازک پردوں سے ٹکرا ٹکرا کر آپ کی نرم و نازک طبیعت پر ایک گراں بوجھ بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آپ کی صحت کا ستیاناس کر ڈالے گی اور پھر یورپ تو کیا دنیا کے کسی بھی قابل سے قابل ڈاکٹر کے سنبھالے نہ سنبھلے گی ... ہندوستان بھی اب کوئی رہنے کے قابل ملک رہا ہے پتہ نہیں کیسے کیسے خشک اور زاہد مزاج لوگوں کے ہاتھ حکومت کی باگ ڈور آ گئی ہے جگہ جگہ شراب بندی جیسے "بیہودہ" قانون نافذ ہو رہے ہیں - بھلا شراب کے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی ہے - میں تو ایسی زندگی کو زندگی نہیں بلکہ شرمندگی سمجھتا ہوں - مجھے پختہ یقین ہے کہ آپ ہندو کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہو گئے - خدا نے جو آپ کو بے پناہ دولت بخشی ہوئی ہے اس کا جائز اور معقول ترین استعمال صرف یورپ یا امریکہ میں ہی ہو سکتا ہے غریب ہندوستانی نہ تو خود عیش کر سکتے ہیں اور نہ آپ ایسے دولتمند لوگوں کو بھی عیش کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں - اگر آپ ہندوستان میں رہے تو مجھے ڈر ہے کہ آپ کی گزری ہوئی شان و شوکت کے ساتھ ساتھ کہیں اپنے بزرگوں کی خون پسینہ ایک کر کے جوڑی ہوئی بے اندازہ دولت جاگیروں - محلوں - ہیرے جواہرات چمکتی دمکتی موٹر کاروں - نوکر چاکر ملا اور خوبصورت خادماؤں سے بھی ہاتھ نہ دھونے پڑیں - زمانے کی ہوا ایسی بتا رہی ہے کہ آپ کی شاہانہ کروفر اور دبدبہ صرف چند روز کے مہمان

پینٹ - اگرچہ آپ ایسے لوگوں کی ہندوستان سے کوچ کر جانے کی خبر میرے لئے ایک خوفناک حادثہ سے کم نہ ہوگی - لیکن پھر بھی میں آپ کی جان و مال کی سلامتی کی خاطر یہ عظیم صدمہ ہنستے ہنستے برداشت کر لوں گا - اپنے دل پر پتھر رکھ کر آپ کی جدائی کا غم سہہ لوں گا - آپ کے ہجر میں جل جاؤں گا لیکن اُف تک نہ کروں گا میں نہیں چاہتا کہ رجواڑہ شاہی کے لرزتے ہوئے ستونوں کو اپنی ہی زندگی میں اپنی ہی آنکھوں کے سامنے گرتے ہوئے دیکھوں - اگر آپ اپنی خاطر نہیں تو کم از کم مجھ ایسے مدحداروں کا دل رکھنے کے لئے ہی جلد از جلد ہندوستان چھوڑ دیں -

یور ہائی نس میں آپ کو پختہ یقین دلاتا ہوں کہ دس پندرہ سال کے بعد یا میری زندگی میں جب کبھی آپ پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے ہندوستان تشریف لایا کریں گے تو میں بمبئی میں گیٹ وے آف انڈیا کے تاریخی مقام پر آپ کا پرجوش استقبال کیا کروں گا - اگرچہ مجھ ایسے غریب آدمی کے پاس آپ کو سلامی دینے کے لئے توپیں تو نہ ہوں گی لیکن پھر بھی آپ کی عزت افزائی کی رسم کو پورا کرنے کے لئے چھ آنے درجن والے اکیس پٹاخے چلا کر آپ کو خوش آمدید کہا کروں گا -

حضور والا اگر جان کی امان پاؤں تو ایک عرض اور کروں - امید ہے کہ آپ اسے اپنی شان میں گستاخی تصور نہ کرتے ہوئے نہایت ہی ٹھنڈے دل سے اس پر غور فرمائیں گے - عرض یہ ہے کہ جب آپ ہندوستانیوں کو داغ مفارقت دے جائیں گے تو آخر کار ایک ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ ہم آپ لوگوں کو بالکل ہی بھول جائیں - خدانخواستہ اگر ایسا ہو گیا تو رجواڑہ شاہی

کے لئے اس سے بڑھ کر خوفناک ٹریجیڈی اور کیا ہوگی۔ کئی سالوں سے یہ دہشتناک خیال میرے دل و دماغ کو بُری طرح سے پریشان کر رہا تھا۔ مگر آپ کو یہ سُن کر از حد مسرت ہوگی کہ حال ہی میں میں نے اس اُلجھن پر قابو پا لیا ہے اور اپنے نام و نشان کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے ایک پلان مرتب کر لیا ہے۔ وہ پلان یہ ہے کہ جب عیش و عشرت کی قابلِ رشک زندگی بسر کر سکنے کے بعد آپ عمر رسیدہ ہو کر دوسرے جہان کو کوچ کر جانے کی تیاری فرما رہے ہوں تو مندرجہ ذیل وصیت کر جائیں۔

"میں مہاراجہ گرطیدہ لقائمی بہ ہوش و حواس یہ وصیت کرتا ہوں کہ میری وفات کے بعد میری لاش کو مصر کے قدیم بادشاہوں کی لاشوں کی طرح خراب نہ ہونے والے مصالحوں سے بھر کر پوری حفاظت سے کلکتہ کے عجائب گھر میں رکھ دیا جائے تاکہ اسے دیکھ کر موجودہ یا آنیوالی نسلیں یہ اندازہ لگا سکیں کہ مہاراجہ لوگ کیسے ہوتے تھے۔ اُن کی شکل و صورت اور لباس کیسا ہوتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ میں اپنے دیگر حکمران بھائیوں کو بھی یہی مشورہ دیتا ہوں کہ وہ بھی میرے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی لاشوں کو دنیا کے مختلف عجائب گھروں میں پوری پوری حفاظت سے رکھے جانے کی بابت وصیت کر جائیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے بزرگوں کے حالاتِ زندگی بھی لکھوا کر رکھ جائیں تاکہ تاریخ نویسوں کو ان کے حالات کی ریسرچ کرتے وقت زیادہ مغز کھپائی نہ کرنی پڑے اور وہ آسانی سے اُن کی زندگیوں پر روشنی ڈال سکیں۔"

کہئے مہاراجہ صاحب۔ پسند آیا نا میرا پلان؟ اوہو۔ آپ تو

کافی سے زیادہ خوش دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں نہیں! کیوں نہیں!! بات ہی خوشی کی ہے .... کسی انسان کے لئے اس سے بڑھ کر شاید ہی خوشی کی کوئی اور بات ہوتی ہو کہ مرنے کے بعد بھی اس کا نام زندہ رہے گا۔ اچھا تو حضور اسی خوشی میں ہم پر بھی کچھ نظرِ عنایت ہو جائے۔ سنا ہے کہ یور ہائی نس اپنے بزرگان عالی نسب کی طرح فیاض اور دریا دل ہیں .... دریا دل ہی نہیں بلکہ سمندر دل ہیں جب کسی پر خوش ہو جاتے ہیں تو یہ بھی نہیں سوچتے کہ بخششوں کے بھاری بوجھ سے کہیں انعام پانے والے کی کمر ہی نہ ٹوٹ جائے۔ لیکن حضور یقین فرمائیں کہ اس معاملے میں میری کمر کافی مضبوط ہے مگر رونا اس بات کا ہے کہ ابھی تک کوئی کمر توڑنے والا ہی نہیں ملا۔ ایک گمنام سا ادیب ہوں اور دیگر ادیبوں کی طرح اپنے ملک کے ناشروں اور اخباروں و رسالوں کے مالکوں کے ہاتھوں سخت نالاں ہوں لکھنے کے لئے فرمائشوں پر فرمائش بھیجتے ہیں لیکن جب معاوضے کی ادائیگی کا وقت آتا ہے۔ تو بچھڑوں کی مانند منہ بنا کر دانت دکھلا دیتے ہیں۔ اگر کچھ دیتے بھی ہیں تو صرف آنسو پونچھنے کے لئے۔ ان کے معاوضہ کی رقم اتنی مختصر ہوتی ہے کہ دینے والے کی نسبت لینے والے کو کہیں زیادہ شرم آجاتی ہے۔ شاید ان لوگوں کا خیال ہے کہ شاعر اور افسانہ نگار جسمانی خوراک کی بجائے رومانیت کے وٹامن چبا چبا کر زندہ رہتے ہیں اور ادبی شاہکاروں کی جگالی کرتے رہتے ہیں۔ یور ہائی نس۔ میں آپ کو پختہ یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے بندہ کو ایک دفعہ بھی خوش کر دیا تو آپ کی اور آپ کے عالی وقار آباؤ اجداد کی شان

میں کیسے ایسے تعصب سے تحریر کرونگا۔ کہ آپ تو کیا آپ کے بزرگوں کی روحیں
بھی وجد میں آکر بھگوان شوجی کے تانڈو ناچ کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیں گی
امید کرتا ہوں کہ اس صحت افزا خط کو پڑھ کر آپ کی ناساز
طبیعت پر کافی خوشگوار اثر پڑے گا اور آپ واپسی ڈاک اپنے شکریہ کے
سے مجھے جو ہما اور انعام دونوں بھجوانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔
دیگر ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ تا زندگی آپ کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ منبدد
اپنے دیگر ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ تا زندگی آپ کی جان و مال کو
دعائیں دیتا رہے گا۔

میں ہوں آپ کا خیرخواہ

ر۔ ج۔ س۔

معمّے بازی سے معمّے سازی تک

آج سے تین سال پیشتر میں دنیا کا سب سے زیادہ بیوقوف انسان تھا
مجھ سے زیادہ جاہل، خبط دماغ اور بھونڈا انسان دن کو چراغ لیکر ڈھونڈنے
سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔ بیوقوفی اور جہالت کی دیوی بعض اوقات مجھے دیکھ
کر مارے شرم کے اپنا منہ چھپا لیتی کیونکہ کند ذہنی اور خرد ماغی میں میں اس
سے بدرجہا بہتر تھا۔ عقل اور سمجھ بوجھ سے مجھے خدا واسطے کا بیر تھا۔ دانشمندی
اور فہم و فراست میری دشمن نمبر ایک تھیں۔ مگر کیوں؟ .... میں اتنا
"منجھا ہوا" بیوقوف کیوں تھا۔ میں نے اپنے دماغ میں سے عقل کو لاٹھیاں مار مار کر
کیوں بھگا دیا تھا .... اُسے گھاس چرنے کے لیے کیوں کھلا چھوڑ
دیا تھا۔ کیا مجھے مالیخولیا ہو گیا تھا؟ .... جی نہیں +
تو پھر کیا وجہ تھی۔ کہ میں فرسٹ کلاس قسم کا بیوقوف بن گیا۔ یوں ہے

نے تعلیم کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے ؟

میں نے احمق پن کی ناقابل تسخیر۔ دشوار گذار اور بلند چوٹی کو کیسے فتح کر لیا ؟

آخر میری اس ہمہ گیر اور بین الاقوامی جہالت کی وجہ کیا تھی ؟

ان سب باتوں کا جواب صرف ایک لفظ میں چھپا ہوا ہے۔ ....

اور وہ لفظ ہے "معمہ بازی"، جس کا مطلب ہے معمے حل کرنا۔ جی ہاں۔ ......

...... میں معمے حل کیا کرتا تھا ...... اور وہ بھی ہندوستانی اخبارات اور رسالوں کے! ان اخباروں اور رسالوں کے معمے جو کہ ہر ماہ لاکھوں روپے کے نقد انعامات (جن کی مجموعی تعداد کروڑوں روپوں تک جا پہنچتی ہے۔) اپنے بھولے بھالے غریب قارئین کے درمیان ان کی دماغی اور مالی حالت "سدھارنے" کے لئے تقسیم کرنا اپنا ایمان خیال کرتے ہیں۔ جب میں نے پہلے پہل معمے حل کرنے شروع کئے تھے۔ تو میرا خیال تھا کہ سب ہندوستانیوں کو ان اخباروں اور رسالوں کے مالکوں کی اس فیاضانہ قومی اور ملکی خدمت کے تہہ دل سے مشکور و ممنون ہونا چاہیئے اور اگر ہو سکے تو ان کے سامنے سجدہ بجا لانے سے احتراز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ ہمارے کس طرح محسن ہیں کہ بھر بھر کر اپنی دولت "لٹا" رہے ہیں۔ ہر ماہ انعامات کی رقموں کو دوگنا اور تگنا کرتے رہتے ہیں۔ عوام کی دماغی اور مالی خدمت کا تو انہوں نے بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔ پتہ نہیں یہ ہمارے کہاں کہاں سے معمے انوکھے گھڑ لاتے ہیں۔ اور ہر ماہ اپنے معمہ باز قارئین کی جیبوں میں زبردستی ٹھونس دیتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں خدمت خلق کا بے غرضانہ جذبہ اور دیانت محبت

شاید آپ کو یہ سن کر غش آجائے کہ کئی ایک اخبار اور رسالے ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کے کرائے کے دفتر میں ان کے سارے فرنیچر، سٹیشنری اور دیگر الم غلم اشیاء کو اکٹھا کر کے نیلام کیا جائے تو ان کی مجموعی قیمت پانچ سو روپے سے زیادہ نہ ہوگی۔ مگر حیرانی اس بات پر ہے کہ وہ ہر ماہ باقاعدہ پندرہ بیس ہزار روپے کے نقد انعامات بغیر کسی قسم کی تاخیر کے نہایت ہی "ایمانداری" سے تقسیم کرتے ہیں۔ پتہ نہیں سب بیچارے کہاں کہاں ڈاکے مار کر اپنے پڑھنے والوں کے لئے روپے کا اتنا معقول انتظام کرتے ہیں۔ خدا ان کو اس نیک کمائی میں برکت دے!

ہاں تو میں مبتلا رہا تھا کہ میری اس عظیم الشان بیوقوفی کا آغاز معمّہ بازی کی بدولت ہوا۔ معمے حل کرنے کے شغل کو میں نے دولت مند بننے کا سب سے آسان ذریعہ سمجھا تھا۔ معمہ سازوں کے لاکھوں روپے کے نقد انعامات کی تفاصیل پڑھ کر میری آنکھیں چندھیا اٹھتی تھیں۔ اگر کسی معمے کا پہلا انعام ایک لاکھ روپے کا ہوتا اور میں اسے حل کر کے بھیجتا تو جب تک اس کا صحیح حل شائع نہ ہو جاتا، تب تک میں اس ایک لاکھ روپے کی گراں قدر رقم کو خرچ کرنے کے بہترین طریقے سوچتا رہتا۔ میں سوچتا کہ انعام آنے پر اپنے پرانے مکان کو چھوڑ کر امریکن طرز کی نئی کوٹھی میں جا بسوں گا۔ سواری کے لئے "بیوک" رکھوں گا۔ گرمیوں کا "امیٹ معمہ باز" موسم شہر کی جھلسا دینے والی لو اور گرمی سے دور کسی صحت افزا مقام کی حسین اور رنگین فضاؤں میں گزارا کروں گا۔ سچ پوچھو تو میں ہندوستان کے پہاڑی مقامات کی آب و ہوا کو ہی تمام طبیعت کی گرمی مٹانے کے لئے گھٹیا خیال

کرتا تھا اس وقت میں سوئٹزرلینڈ کے سوا کسی اور صحت افزا مقام پر جانا باعث توہین سمجھتا تھا۔ مگر جب معمے کا صحیح حل شائع ہوتا۔ تو مجھے سانپ سونگھ جاتا۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے کوہ ہمالیہ کو چوٹی سے توڑ کر اٹھا کر میرے سر پر پھینک دیا ہو۔ جو کوئی بھی مجھ سے بات کرتا میں اسے باؤلے کتے کی طرح کاٹنے کو دوڑتا۔ میری خیالی کوٹھی کی بنیادیں قارون کے خزانے کی طرح زمین میں دھنس جاتیں اور "بیوک کار" اپنی پوری رفتار سے میرے ارمانوں کو کچلتی ہوئی بدقسمتی کے گہرے گڑھے میں جا گرتی۔ سوئٹزرلینڈ جاتا کون۔ کتار میں اپنی طبیعت کی گرمی مٹانے کے لئے کمپنی باغ بھی نہ جا سکتا۔ میرا حلیہ کچھ اس طرح بگڑ جاتا۔ کہ دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ میں ابھی ابھی کسی عزیز کو کفنانے دفنانے سے فارغ ہوا ہوں۔ غرضیکہ معمے کا صحیح حل میری امیدوں کے "ہیروشیما" کے لئے ایٹم بم کا دھماکہ ثابت ہوتا۔ میں یہ عظیم صدمہ اٹھا کر تہیہ کرتا کہ آئندہ کوئی معمہ حل کر کے نہیں بھیجوں گا۔ مگر ابھی تو میری بے وقوفی کا آغاز ہی تھا۔ اگر میں اور معمے حل کر کے نہ بھیجتا تو بے وقوفوں کی تاریخ میں میرا نام سنہری حروف میں کیسے لکھا جاتا!

کہتے ہیں کہ وقت بڑے سے بڑے گھاؤ کو مندمل کر دیتا ہے۔ یہی حال میرا ہوا۔ پرانے صدمات کو بھول کر میں نئی امنگوں اور نئے ارادوں سے مسلح ہو کر نئے سرے سے معمہ بازی کے میدان میں ڈٹ جاتا۔ تھوڑے حل بھیجنے کی بجائے سینکڑوں حل بھیجتا۔ تاکہ پہلا انعام کسی دوسری طرف نہ کھسک سکے مگر صحیح حل شائع ہونے پر میرا حشر ایک دفعہ پھر ماتمی بن جاتا۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے مجھے ابھی ابھی کئی ہزار وولٹ کا برقی کرنٹ چھو گیا ہو۔ امیدوں پر

اوس پڑ جاتی اور آرزوؤں پر اوسے تمناؤں کی لہلہاتی فصل کو ناکامیوں کا ٹڈی
دل دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر جاتا۔

میں سب بے وقوفی کی منزلیں نہایت تیزی سے طے کر رہا تھا۔ ہر ناکامی میرے
شوق کو تازیانہ لگاتی میں نئے جوش اور ولولے کے ساتھ نئے معمے
حل کر کے بھیجتا۔ ہر ایک اخبار اور رسالے کے معموں کے زیادہ سے زیادہ
حل بھیجتا۔ تاکہ اگر پہلا انعام نہیں تو کم از کم سب سے زیادہ حل بھیجنے والا
انعام تو مل جائے۔ پہلا انعام تو خیر کیا آنا تھا۔ زیادہ حل بھیجنے پر ملنے والے
انعامات بھی اور ہی صاحبان لے جاتے۔ جو مجھ سے بھی زیادہ تیزی سے دولت مند
بننے کے شوقین تھے۔

میں احمق پن کی سب سے بلند چوٹی سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر
ہی رہ گیا تھا!

میں اور بھی سرگرمی سے زیادہ سے زیادہ حل بھیجنے لگا کسی قسم
کا معمہ میں نے حل کرنے سے نہیں چھوڑا۔ کیا ادبی اور کیا تفریحی۔ کیا فلمی اور
کیا معلوماتی۔ ہر قسم کی ڈکشنریاں ہوتیں اور معموں پر بحث کرنے والے مختلف
رسالوں کے درمیان گھرا ہوا میں دماغ سوزی کرتا رہتا۔ سچ کہتا ہوں کہ جتنی محنت
سے میں معمے حل کرتا تھا اگر اتنی ہی محنت سے کوئی ادبی ریسرچ کرتا تو ضرور ہی
ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کر لیتا۔ مگر افسوس پہلا انعام نہ آنا تھا نہ آیا
البتہ کبھی کبھار میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے ڈیڑھ دو روپیہ کا چار غلطیوں والا
انعام آ جاتا۔

جب میں نے سٹہ بازی شروع کی تھی اس وقت میرے پاس پندرہ ہزار روپے نقد تھے، بیس ہزار کاروبار میں لگے ہوئے تھے، اور پچیس ہزار روپے کی جائیداد تھی۔ یعنی میری مالی حیثیت تقریباً ساٹھ ہزار کی تھی مگر اب ساٹھ ہزار کی رقم کے آخری دو صفر اُڑ گئے تھے۔ یعنی صرف چھ سو روپیہ رہ گیا تھا۔ اپنا مکان بیچ کر جب یہ امریکن طرز کی کوٹھی میں جا بسنے کی بجائے کرائے کے ایک مکان نما کھنڈر میں پہنچ گیا تھا۔ "بیوک" کی سیر کرنے کی بجائے اپنی "ریلے" کی سائیکل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ گرمیوں میں مجھے اب سوئٹزرلینڈ کی سیر کی بجائے گرمی اور لُو سے بچنے کے لئے ہندوستان کے کسی گھٹیا سے پہاڑی مقام پر جانے کی توفیق تک نہ ہوئی۔

آخر میں یہ چھ سو روپیہ بھی آخری داؤ پر لگا دیئے۔ مگر یہ بھی معمّہ سازوں کی تجوریوں میں چلے گئے۔ میں پیسے پیسے کو قلاش ہو گیا۔ کاروں اور کوٹھیوں کے خواب دیکھتا دیکھتا جو دال روٹی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تو میرے دماغ کے چند پرزے ڈھیلے ہو کر ۔۔۔ اپنی جگہ سے ہل گئے۔ دیانت دار معمّہ سازوں نے میری مالی حالت تو پہلے ہی سدھار دی تھی مگر اب دماغی حالت بھی "سدھر" گئی۔ لہٰذا مجھے لمبے عرصے کے لئے پاگل خانے میں داخل کر دیا گیا۔

اب میں دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف بن چکا تھا!

خوش قسمتی سے مجھے پاگل خانے سے جلد ہی چھٹی مل گئی۔ میرا دماغ دوبارہ صحیح حالت میں آ چکا تھا اور اب مجھے پیٹ پالنے کے لئے کوئی کام کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ تمام پونجی تو معمّہ سازوں کی نذر ہو چکی تھی۔ اس لئے کوئی باعزت

کام نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا اُسی سے پانچ روپے اُدھار لے کر گول گپّوں کا خوانچہ لگانا شروع کر دیا۔ جب مجھے میرے یار دوستوں نے خوانچہ لگاتے ہوئے دیکھا تو انہیں میری حالتِ زار پر بے اختیار ترس آ گیا۔ اور انہوں نے آپس میں چندہ اکٹھا کر کے مجھے تیل نکالنے کے دو کولہو لگوا دیئے۔ گذارہ اچھا ہونے لگا۔ اور میں معمّہ سازوں کی جان کو دعائیں دیتا ہوا نہایت ہی مزے سے تیل بیچنے لگا۔ چونکہ میں نے فارسی بھی پڑھی ہوئی تھی۔ اس لئے ایک دن تیل بیچتے بیچتے اُردو کی یہ کہاوت بے اختیار میرے منہ سے نکل گئی۔

"پڑھے فارسی بیچے تیل۔ دیکھو لوگو قسمت کے کھیل"

خیر جب مجھے تیل بیچتے ہوئے دو تین مہینے گذر گئے تو ایک دن ایک کلرک اپنے دوست سے ملاقات ہوئی جو کافی عرصہ کسٹوڈین میں رہ کر اچھی خاصی رقم جمع کر کے لایا تھا۔ معمّہ سازوں کے ہاتھوں جو میری گت بنی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ دانتوں تلے انگلیاں دبا کر رہ گیا۔ رونے دھونے کے بعد میں نے اُسے اپنی عبرت آموز داستانِ غم سنانے کے بعد کہا "جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ مگر لوگوں کو میری تباہی سے سبق سیکھنا چاہیئے۔ میں تو مرتے وقت اپنے بچوں کو نصیحت ہی نہیں۔ بلکہ وصیت کر جاؤں گا کہ بیٹا۔ چاہے تم شیر کی غار کے اندر گھس کر اس سے کبڈی کھیل لینا۔ چاہے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھ کر قلابازی لگا لینا۔ لیکن معمّے کبھی نہ حل کرنا۔ خاص کر ہندوستانی اخبارات اور رسالوں کے"

یہ سُن کر میرا دوست کچھ سوچنے لگ گیا۔ میں سمجھا کہ وہ دل ہی دل میں

میری بیوقوفی کا ماتم کر رہا ہے۔ مگر وہ تھوڑی دیر کے بعد بولا "فکر نہ کرو۔
تمہارے روپے واپس مل سکتے ہیں۔ اور وہ بھی سود کے ساتھ"

"وہ کیسے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"معمّوں کے ذریعہ ہی" وہ بڑے اطمینان سے بولا

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں پھر معمّے بازی شروع کر کے اپنے چلتے ہوئے کاروبار کو بند کر ڈالوں اور دوبارہ اس مصیبت کے پاگل خانے میں ٹہلتا ہوا نظر آؤں" میں نے قدرے رنجش سے پوچھا۔

"نہیں اس دفعہ تم معمّے باز نہیں بلکہ معمّے ساز بنو گے"

"یعنی"؟

"یعنی یہ کہ اب میں اور تم مل کر ایک رسالہ جاری کر کے معمّہ سازی کا کام شروع کر دیں گے۔ ہمارے پہلے ہی معمّے کا پہلا انعام پچاس ہزار روپے کا ہوگا"

"مگر اتنی رقم کا انتظام کہاں سے ہوگا۔ میرے پاس تو اس وقت پچاس ہزار روپے تو کجا پچاس ہزار اٹھنیاں بھی نہیں ہیں۔"

"روپیوں کا فکر تم مت کرو ---- میں سب انتظام کر لوں گا۔"

قصہ مختصر ہم نے چند روز بعد خدا کا نام لے کر ایک رسالہ جاری کر دیا اور اپنے معمّوں کا نام رکھا "لکشمی معمّے"۔ اپنے رسالے کے علاوہ دوسرے رسالوں اور اخباروں میں بھی اس کی خوب پبلسٹی کروائی۔ ہمارے معمّے کا

خوش قسمتی سے ہمیں پہلے ہی ساٹھ سکے داخلوں کی فیس کی شکل میں ایک لاکھ دس ہزار روپیوں کے
قریب وصول ہو چکے۔ بس پھر کیا تھا۔ مارے خوشی کے ہماری باچھیں کھلی جا رہی تھیں
اتنی آمدنی دیکھ کر مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ ابھی تک ہندوستان میں بے وقوفوں کی
کمی نہیں ہے۔ میں نے تو اپنے آپ کو ہی سب سے زیادہ بیوقوف سمجھتا تھا۔ مگر
مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ ان گنت لوگ مجھ سے بھی زیادہ "پہنچے ہوئے" ہیں۔
جب انعام جیتنے والوں کی فہرست تیار ہونے لگی تو میں نے اپنے دوست سے کہا۔
"پچاس ہزار تو ہو گئے پہلے انعام کے اور بیس ہزار لے چار عطیوں تک کے انعام
والوں کے۔ یہ تو ہو گئے ستر (۷۰) ہزار اور ان میں دس ہزار ڈال لو پبلسٹی اور دیگر اخراجات
کے۔ کل ملا کر ہو گئے اسی (۸۰) ہزار۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں تیس ہزار کا
خالص منافع ہوا۔ اور وہ بھی پہلی مرتبہ میں ہی"

"تم بھی بہت بھولے ہو" میرا دوست طنزیہ لہجے میں بولا۔
"کیوں۔ کیا حساب میں کوئی غلطی ہو گئی ہے؟" میں نے گھبراتے ہوئے پوچھا
"نہیں۔ اس میں حساب کی کوئی غلطی نہیں" میرا دوست مسکراتا ہوا بولا۔ "اگر
تم ایسے ہی ایمانداری سے لوگوں کو انعام دینے لگ گئے تو پھر کر چکے جعل سازی
یہ اور ایمانداری دو متضاد چیزیں ہیں۔ اور یہ دونوں ایک جگہ ہرگز ہرگز اکٹھی
نہیں رہ سکتیں۔ ہم ساری رقم میں سے دس ہزار روپیہ ہی تقسیم کریں گے۔
صرف دس ہزار۔ یہ کہہ کر حیرانگی کے عالم میں میرا منہ کھلے کا کھلا
ہی رہ گیا۔
جی ہاں۔ دس ہزار صرف۔ یہ بھی پہلا موقع ہونے کی وجہ سے دے رہا

تھا۔ ورنہ ہم ہزار پانچسو میں ہی معاملہ نپٹا لیتا۔ میرا دوست فخریہ انداز میں بولا۔

"مگر یہ سب ہوگا کیسے؟ کیا دوبارہ معمہ نکالنے کا ارادہ نہیں ہے؟"
میں نے احتجاج کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم بھی نرے کاٹھ کے الّو ہو۔ تم کیا جانو معمہ سازی کے راز۔ لیکن چپ چاپ تیل کی دھار دیکھتے رہو۔ دیکھو میں سب کچھ کیسے نپٹاتا ہوں۔"

چند روز بعد۔ جب انعامات کی مکمل فہرست شائع ہوئی۔ تو پہلا انعام میرے دوست کے بھانجے کے نام نکلا اور چھوٹے انعامات کی فہرست میں آدھے نام جعلی تھے!

میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب کہ دوسرے معمے میں ہمیں دو لاکھ روپے کے قریب فیس داخلہ وصول ہوئی۔ حالانکہ میرا خیال یہ تھا کہ اس دفعہ ہمیں ڈیڑھ ہزار روپے کا بھی دیدار نصیب نہ ہوگا۔ مگر داد دینی چاہیئے ہندوستانیوں کی سادہ لوحی کی ان کے ساتھ جتنا بھی زیادہ دھوکا ہوتا ہے یہ اتنی ہی گرمجوشی سے مزید دھوکا کھانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ جوں جوں ہمارے معمے نکلتے گئے توں توں ہمارا بینک بیلنس بڑھتا گیا۔ چھ ماہ کے آخر میں ہمارے پاس اٹھارہ لاکھ روپے سے بھی زیادہ روپے جمع ہو سکے۔ "لکشمی معمے" واقعی ہمارے گھر میں لکشمی لانے کا سبب بن گئے۔ اب میرے پاس جدید امریکن طرز کی کوٹھی ہے۔ ایک چھوڑ دو بیوکیں ہیں۔ اور سوئٹزرلینڈ تو کیا سارے یورپ کی سیر کر چکا ہوں۔ مختصر یہ کہ ہر قسم کا سامان آرائش

آرام اور آسائش ہے اور جیکھوا کر عیش کے مزے لوٹتا ہوں۔ سماج میں بھی درجہ اونچا ہو گیا ہے ہمارے معموں کا پہلا انعام عام طور پر ایک پبلک تقریب میں کسی وزیر کے دست مبارک سے ہی دلوایا جاتا ہے یوں تو ہمیں ہر قسم کی فارغ البالی حاصل ہے۔ مگر کچھ مہینوں سے ایک کانٹا سا دل میں کھٹک رہا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ چند حاسدوں نے یہ آواز اٹھانی شروع کر دی ہے کہ معموں پہ گورنمنٹ کو کنٹرول کرنا چاہیے۔ اگر معمے تو ان کو سرے سے ہی بند کر دینا چاہیے۔ نہیں تو ان کے حساب و کتاب پر کڑی نظر رکھ کر باقاعدہ پڑتال کرنی چاہیے۔ نیز کوئی معمہ بغیر گورنمنٹ کے نام ہیں۔ ایسے قانون بنتے بھی دیر نہ لگے گی اور اس وقت تک ہم اتنا روپیہ اکٹھا کر چکے ہوں گے کہ ہم اور ہماری سات پشتیں بھی اسے ختم نہ کر سکیں گی۔ معمے سازی سے بڑھ کر روپیہ کمانے کا اور کوئی آسان طریقہ نہیں۔ اسی وجہ سے میں آج دنیا کے سب سے زیادہ عقل مند آدمیوں میں سے ایک ہوں۔

معمے زندہ باد! کراس ورڈ پائندہ باد! قومی حکومت تابندہ باد!!

میں نے اخبار پڑھنا کیوں چھوڑا

چند دن سے میں نے اخبار بینی ترک کی ہے اُسی دن سے ہی میرے دوست و احباب طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔ ایک دوست کا خیال ہے کہ شاید میری نظر خوفناک حد تک کمزور ہو گئی ہے اسی وجہ آنکھوں کے کسی ماہر ڈاکٹر نے مجھے ہر قسم کے مطالعہ سے منع کر دیا ہو۔ جب ان حضرت کے اس سنسنی خیز انکشاف پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں۔

"ضرور یہی بات ہو گی ورنہ ایک ایسا شخص جسے روزانہ کم از کم تین اخبار پڑھے بغیر کھانا ہضم نہ ہوتا ہو وہ عام حالات میں یک لخت اخبار بینی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں تو پہلے ہی اسے کہا کرتا تھا کہ وہ اخباروں۔ ناولوں اور رسالوں وغیرہ کا زیادہ مطالعہ نہ کیا کرے۔ مضمون کم لکھا کرے۔ نظر تو اس کی پہلے ہی کمزور تھی اب اور زیادہ ہو گئی ہو گی۔ وہ بھلا کب کسی کی سنتا ہے اب بچو جی کو جب آنکھوں کا اپریشن کروانا پڑے گا تب یاد آئے گی میری نصیحت۔۔ ایک اور صاحب کا خیال ہے کہ میں آہستہ آہستہ تارک الدنیا ہوتا جا رہا ہوں کیونکہ سگریٹ پینے تو میں نے پہلے ہی چھوڑ دیئے ہیں۔ اب اخبار بینی سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ عنقریب یہ موصوف کھانا پینا چھوڑنے کی بھی صلاح کر رہے ہوں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے مہربان مخلص دوستوں کے جو جو اندازے ہیں غلط ہیں۔ نہ تو مجھے آنکھوں کے کسی سپیشلسٹ نے کسی خطرے کی اطلاع دی ہے اور نہ ہی میری دماغی حالت کی گڑبڑ ہے۔ نہ تو میں دنیا

سے تنگ آکر گوشۂ عافیت اختیار کر رہا ہوں اور نہ ہی مجھے فالتو وقت کے تعطل کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ اب آپ حسبِ دستور پوچھیں گے کہ ارے بھلے مانس اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر تمہیں ترکِ اخبار بینی کی حاجت کیوں پیش آئی۔ کیا تمہیں خواب میں کسی بزرگ نے آکر کہا ہے کہ تم اخبار پڑھنا بند کر دو۔ نہیں حضرت نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میرے اخبار بینی کے تجربہ نے مجھ پر چند ایک ایسی مکروہ حقیقتوں کو آشکارا کیا ہے کہ اگر وہ حقیقتیں آپ پر بھی منکشف ہو جائیں تو شاید ...... شاید کیا یقیناً آپ بھی آج ہی اخبار پڑھنا چھوڑ دیں۔ تو لیجئے سنئے کہ میں نے اخبار پڑھنا کیوں چھوڑا۔

بے لاگ تبصرے، صحت مند تنقید، تعصب سے بالاتر آرٹیکل اور شگفتہ ادب تو ہمارے اخبارات کا ایکسرے لینے پر بھی کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ اکثر اوقات ہمارے اخبار نویس اصولوں کی بلند چوٹی سے لڑھک کر ذاتیات کی گہری کھائی میں گر پڑتے ہیں اور ایک دوسرے پر اس طرح کیچڑ اچھالتے ہیں کہ بیچارے قارئین بھی اس کیچڑ کے چھینٹوں سے محفوظ نہیں رہتے۔ اسی طرح ایک دفعہ دو اخباروں کے ایڈیٹروں کے درمیان بحث چھڑ گئی۔ پہلے پہل تو وہ دلائل سے ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب اس میدان میں انہیں ناکامی ہوئی تو وہ ذاتیات پر اتر آئے۔ ایک ایڈیٹر نے لکھا:

اجی صاحب! آپ جو پچھلے [illegible] سے اپنی [illegible] کی [illegible]

دکھا رہے ہیں۔ "فلاں ستیہ گرہ کے دنوں میں آپ نے کون سا رول ادا کیا تھا۔ عوام کو تو دھڑا دھڑ جیل میں پہنچا دیا اور خود اپنے بیٹے کو ان دنوں ولایت بھیج دیا۔ بہانہ یہ بنایا کہ برخوردار اونچی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت گئے ہیں اور آپ بذات خود خرابی صحت کی بنا پر اپنے دفتر میں چوڑیاں پہن کر بیٹھے رہے۔"

اس کے جواب میں دوسرے ایڈیٹر نے لکھا۔ "آپ کو ایسا سفید جھوٹ بولتے ہوئے شرم سے چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ عوام آپ کی اصلیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میں تو ان دنوں واقعی سخت بیمار تھا۔ ڈاکٹروں نے چلنا پھرنا بالکل منع کیا ہوا تھا۔ صرف اخبارات کے لیے ایک دو آرٹیکل لکھنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ اسی سے میں جنتا جناردھن کی سیوا کرتا رہا۔ میں ہی جانتا ہوں کہ میرا دل ان دنوں جیل میں جانے کے لیے کتنا بیقرار تھا۔ لیکن آپ شاید بھول گئے کہ کیسی مجبوری کی حالت میں آپ کو ستیہ گرہ کرنا پڑا تھا۔ آپ ستیہ گرہ ہرگز نہ کرتے اگر ستیہ گرہ کے ٹکٹ اور چندہ دینے والے بار بار رقم کی واپسی کا آپ پر زور نہ ڈالتے اور آپ کو یہ دھمکی نہ دیتے کہ آپ کے ستیہ گرہ نہ کرنے کی صورت میں مشتعل لوگ آپ کے دفتر پر دھاوا بول دیں گے۔ آپ کے فرنیچر اور کاغذات وغیرہ کو نذر آتش کرنے کے بعد آپ کی جان کے لاگو ہو جائیں گے۔ یہ تو تھا آپ کے ستیہ گرہ میں...... بھرتی ہونے ذاتی طور پر شامل ہوتے کا سبب مختصر۔ ویسے آپ کی دیش بھگتی اعلانیہ عوام سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ جب ذلیل اور شرمناک طریقے سے آپ نے

مشہور تاجر سیٹھ لدھارام کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اور تو اور ابھی تک آپ کو کسی سے بات کرنے کا سلیقہ تک نہیں آیا۔ پچھلے دنوں تعلیم منتری کی پریس کانفرنس میں ان سے باتیں کرتے ہوئے جب آپ کو چھینک آئی جیسے کہ آپ کو اکثر آتی ہی رہتی ہے تو آپ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ آپ اپنے منہ پر ہاتھ ہی رکھ لیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ چھینک سے چھینٹے اور دوسرا مواد تعلیم منتری صاحب کی داڑھی اور دیگر معززین کے کپڑوں پر جا پڑا۔ آپ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ اپنی اس مضحکہ خیز حرکت کے لئے دوسروں سے معافی تک مانگتے یا صرف ایک لفظ "سوری" ہی کہہ دیتے۔ آپ نے سیٹھ رحیم کے لائق بیٹے عزیز کے اونچی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت جانے پر تو اعتراض کیا ہے لیکن اپنے برخوردار کا قصہ بھول گئے کہ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل نے اسے ایک لڑکی سے فحش مذاق کرنے پر کالج سے باہر نکال دیا تھا۔

دیکھا آپ نے ہمارے اخبار نویسوں کا معیار۔ کیا یہی لوگ ہمارے تعلیمی اور تمدنی معیار کو بلند کریں گے؟ کیا یہی لوگ ہمارے عوام کو سنواریں گے؟ یہ اشخاص اپنے اخباروں میں دوسرے لوگوں کے کارٹون چھاپ کر ان کا مذاق تو اڑاتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ایسی مضحکہ خیز اور لچر اخلاق تحریروں سے وہ عوام کی نظروں میں خود کارٹون بن جاتے ہیں۔

ہاں صاحب یہ تو تھی میری ترک اخبار بینی کی سب سے بڑی وجہ۔ اب لگے ہاتھوں کچھ حال دوسری وجوہات کا بھی سن لیجئے۔ ہمارے اخبارات ہر ایک دو مقصد کی خبروں کے علاوہ باقی سب خبریں فضول اور گھٹیا ہوتی ہیں مثلاً

ایک ٹرک بس کے نیچے آکر ہلاک ہو گیا۔ وقت سے تابوت بھیج دیا گیا۔ تھوڑی دور پر ہوگئے
جبل پور میں بس ایک حادثہ کا شکار ہو گئی۔ تین آدمی مارے گئے اور چار بیمار
ہوئے جن میں ایک حاملہ عورت بھی شامل ہے۔

دہلی بازار میں دو سانڈوں کی لڑائی۔ تماشہ دیکھنے کے لئے
سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے۔ ایک گھنٹے کے لئے ٹریفک معطل ہو گیا۔

مونگیر۔ بریلا میں مالکوں کی دو مخالف پارٹیوں میں زبردست
تصادم۔ لاٹھیوں، کلہاڑیوں اور چاقوؤں کا آزادانہ استعمال۔ چھ اشخاص زخمی
ہوئے۔ مگر پولیس بروقت مداخلت نہ کرتی تو شاید سانحہ نہ قتل اور خون سے
کا ہاں طرفین میں ایک لڑکا بھی شامل تھا۔

قصبہ کلاں میں ناجائز شراب کی خپت۔ ہوئی بھی کم بنٹی تو۔ لڑکی بدنصیب تھی
بیچاری۔ اگر لڑکی ہوتی تو شاید بچ جاتی۔ (؟)

جالندھر۔ محلہ کرم پورہ کی ایک عورت نے عجیب و غریب بچے کو جنا ہے
بچے کے دو سر اور چھ ٹانگیں ہیں۔ ... سر سے ہی غائب ہے۔ لوگ دور دور
دور سے اس عجوبہ قدرت کو دیکھنے کیلئے ہزاروں کی تعداد میں آ رہے ہیں۔

یہ تو رہی خبریں۔ اب آئیے ذرا ان تصویروں کی طرف جو کہ تازہ ترین
شادی شدہ جوڑوں کی آرسی مصحف ... کسی کی شادی ہو یا نہ ہو اس سے
دوسروں کو کیا واسطہ خیر چھوڑئیے اگر کسی نہ کسی طرح کوئی جوڑا ... تو
آپ لوگوں کو اپنی بیویوں کی نمائش سے کیا فائدہ۔ اب ذرا کوئی ان انفرا
والوں سے [illegible] ... اگر ... لینے کے لئے

اپنے جھانسوں" سے دولت پیدا کر رہے ہیں؟"

اسی طرح کچھ عرصہ قبل شائع ہونے والے ایک مضمون کے نیچے کچھ اس طرح لکھا ہوتا تھا۔ یہ مضمون مسٹر ایس۔ آر۔ گجراج آف میسرز فری انڈیا ٹریڈ مارکس نے ہمارے ادارے کو بھیج دیا ہے کہ اسے اس ہفتے بذریعہ ڈاک بھیجا جائے۔ امریکہ، کینیڈا، انگلینڈ اور جرمنی کے دورے پر روانہ ہو رہے ہیں۔ اور اس دورے کی بابت مسٹر گجراج صاحب کاروباری مقصد سے غیر ممالک میں جانا چاہتے ہیں جن کا تجربے سے شوق ہے۔ انہیں کون روک سکتا ہے۔ بیچارے قارئین کو کیوں خواہ مخواہ بور کر رہے ہیں۔ مسٹر گجراج اگر کاروبار کو فروغ دینے کے لیے جا رہے ہیں تو ہمارے اخبار بینوں کو اس سے کیا فائدہ۔ غیر ممالک سے واپسی پر مسٹر گجراج اخبار بینوں کے لئے سوغات تو نہیں لے آئیں گے!

ردی خبروں اور غیر ضروری تصاویر کو چھوڑ کر اب ذرا اشتہارات کی طرف آئیے۔ عموماً اخبارات کے کل مضمون کی ایک تہائی جگہ یہ اشتہار گھیرتے ہیں اور بعض اوقات تو اس سے بھی زیادہ جگہ پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان اشتہاروں میں جن چیزوں کی جتنی تعریف کی گئی ہو اگر انہیں خریدنے پر وہ تعریف کا دسواں حصہ بھی سچ ثابت ہو تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے۔ ایک دفعہ میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار کا اشتہار پڑھا جس کا مضمون حسب ذیل تھا

برائے فروخت

ایک پرانی کار نہایت ہی اچھی حالت میں دیکھنے میں دیدہ زیب

قیمت تقریباً پانچ ہزار روپے نمبر ۹۱۳۴۳

اس اشتہار کے سلسلے میں جب میں اخبار کے ایڈیٹر سے کار کے مالک کا پتہ لے کر ملا تو اپنی زبان سے بھی اس نے کار کی بہت تعریف کی لیکن اس نے کار دکھلائی تو میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اشتہار کے مطابق کار دیدہ زیب تھی لیکن حقیقت میں دیدہ فریب نکلی۔ جگہ جگہ سے روغن اکھڑا ہوا تھا جب میں نے ([illegible]) ٹرائی کے لئے سٹیرنگ STEERING سنبھالا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کار نہیں بلکہ کوئی ٹریکٹر دھکیل رہا ہوں۔ انجن کی اتنی آواز آ رہی تھی کہ سڑک پر راہگیروں کو خبردار کرنے کے لئے ایک دفعہ بھی ہارن بجانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ کار کے اندر بیٹھی ہوئی سواریاں کار کا انجر پنجر ڈھیلا ہونے کی وجہ سے اس طرح ہل رہی تھیں جیسے ملیریا بخار چڑھنے پر سردی محسوس ہونے کی وجہ سے کوئی مریض کانپ رہا ہو۔ دو تین میل کی ٹرائی لینے کے بعد میں بمشکل کار سے نیچے اترا۔ جب اس کے مالک نے میری رائے دریافت کی تو میں نے جواب دیا۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنی کار کو محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کر دیں۔ یہ کہہ کر میں اس کے چہرے کو دیکھے بغیر ہی چلا آیا۔

اسی طرح ایک دفعہ میرے ایک سیدھے سادے دوست نے ایک اخبار میں کسی رنگ گورا کرنے والی دوائی کی بابت پڑھا۔ اشتہار پڑھ کر تو ایسے محسوس ہوتا تھا کہ اگر کوئی حبشی بھی اسے استعمال کرنا شروع کر دے تو چند دنوں میں ہی اس کی جلد اتنی گوری اور خوبصورت ہو جائے گی کہ اگر پرستان کی حوریں بھی اسے

دیکھیں تو فوراً بیزار جان سے اس پر عاشق ہو جائیں۔ لیکن اس دوائی کے استعمال
کے بعد میرے دوست کا رنگ تو کیا گورا ہونا تھا اُلٹے اس کے منہ پر چھالے پڑ
گئے اور وہ بیچارہ کئی دنوں تک مرہم پٹی کرواتا رہا۔ میرے خیال میں تو اس دوائی
کا مشتہر کوئی دھوبی تھا۔ اس نے دیکھا ہوگا کہ جب پانی میں تحلیل شدہ
تیزاب سے کپڑوں کی میل اور کالاپن دور ہو جاتا ہے تو کیوں نہ اس کیمیکل کو
دوائی بنا کر کالے رنگ والوں کو گورا کرنے کا ٹھیکہ لے لیا جائے۔

میرے اخبار بینی کو ترک کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مندرجہ بالا خرافات
کے بعد اخبار میں جو جگہ بچتی ہے اس کا ایک معقول حصہ منڈیوں کے بھاؤ،
کمیٹیوں کی خبروں، عدالتوں کے سمن، ٹینڈر نوٹس کے اشتہاروں وغیرہ میں ضائع
ہو جاتا ہے۔ کیا بیوپاری اور کھلاڑی لوگ "مددگار بیوپاریاں یا سپورٹس مین"
جیسے اخبار اور رسالوں کو خرید کر اپنا شوق نہیں پورا کر سکتے جو روزانہ اُن کے
لئے ایک صفحہ اخبار میں مخصوص کیا جاتا ہے۔

ان سب چیزوں کے علاوہ "موسم کا حال" اپنے نام سے ایک کالم
اور کیا ہوتا ہے۔ موسم کے بارے میں جتنی پیشگوئیاں ان کالموں کی
غلط ہوتی ہیں اتنی تو شاید ہندوستان کے نام نہاد جیوتشیوں کی بھی غلط
نہ ہوتی ہوں گی۔ اگر اس کالم میں یہ پیشینگوئی ہو کہ آج فلاں خطہ موسم
ابرآلود رہے گا تو اکثر اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ وہاں سورج اپنی پوری
آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہوتا ہے۔ اور اگر یہ لکھا ہوا ہو کہ آج
فلاں علاقوں میں آندھی آئے گی تو وہاں دیکھنے میں آتا ہے کہ آندھی تو

درکنار۔ جو اب بند ہو جانے کی وجہ سے ایک پیسہ تک نہیں رہا)۔

صاحبان یہی تھیں وہ وجوہات جو میری ترک اخبار بینی کا باعث بنیں۔ اس لئے اب اخبار پڑھنا تو درکنار اُسے دیکھنے تک کو میرا دل نہیں کرتا ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر آپ اب بھی اخبار پڑھنے پر مصر ہیں تو میں آپ کے حق میں دعائے خیر کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتا ہوں!

ایک ادیب کی فریاد

کل شام جب میں دفتر سے گھر واپس آ رہا تھا تو شہر کے سب سے بارونق چوک میں ایک نہایت ہی دلچسپ منظر دیکھنے میں آیا۔ بے شمار لوگوں کے درمیان گھرا ہوا ایک گندم رنگ ادھیڑ عمر کا شخص اپنے سر پر زور زور سے جوتے مار مار کر کہہ رہا تھا "تف ہو تجھ پہ نہیں بد قسمتی کی ڈال سے منحوس گھڑی میں مجھ سے ادیب بننے کی لغو حرکت سرزد ہو گئی۔ جس دن سے میں نے یہ ذلیل پیشہ اختیار کیا ہے آج کے دن سے مجھے کبھی دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوا۔ حالانکہ میں نے ادیب بننے کو ترقی، خوشحالی، سر اونچا کرنے اور دولت و شہرت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھا

تھا - مجھے معلوم نہ تھا کہ یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک کے مقابلہ میں
ہمارے ملک کے ادیبوں کی حالت نہایت ہی کمزور اور خستہ ہے -
مسلسل فاقوں کے باعث میرا پیٹ پیچھے سے جا لگا ہے - ان دونوں
میں بیشمار ہڈیاں ابھرنے کے باعث ایک ایسی دلفریب یکسانیت پیدا ہو گئی
ہے کہ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کو سٹیتھو سکوپ لگاتے وقت یہ معلوم
کرنا دشوار ہو گیا کہ وہ میرے پیٹ کو ٹیسٹ کر رہے ہیں یا پیٹھ کو - جب
سے میں نے لکھنا شروع کیا ہے - تب سے لگاتار میرے سر کے بال
گھٹتے جا رہے ہیں - اور عینک کے شیشوں کے نمبر بڑھتے جا رہے
ہیں - میری صحت اور شکل و صورت اس قدر بگڑ چکی ہے کہ اب مجھ
میں آئینہ دیکھنے کی جرأت بھی باقی نہیں رہی ہے جب کبھی بھولے بھٹکے
پنواڑی کی دوکان پر یا کسی اور جگہ آویزاں آئینے میں مجھے اپنی شکل نظر
آ جاتی ہے تو میں شرم کے مارے گردن جھکا لیتا ہوں - کیونکہ مجھ میں اور
پر میری اور اخبارات میں چھپنے والے کارٹونوں کی شکلوں میں کوئی نمایاں
فرق نہیں ہے - فاقے اور کمزوری کے میرا وزن اس قدر کم ہو گیا ہے
کہ اب میں منوں کی بجائے سیروں اور چھٹانکوں میں تولا جا سکتا ہوں
اس لئے جب کبھی آندھی آتی ہے اور میں گھر پر نہیں ہوتا ہوں تو میری بیوی
اور بچے اس وقت تک اطمینان کا سانس نہیں لیتے جب تک کہ میں
واپس گھر نہیں پہنچ جاتا - ورنہ ہوا کا ایک جھونکا مجھے کسی سوکھے پتے

کی طرح کہیں سے نہیں پہنچا سکتا ہے۔

کہنے کو تو میں نے تقریباً دو درجن ناول بے شمار نظمیں اور سینکڑوں افسانے لکھے ہیں۔ مگر افسوس جیب بھرنا تو درکنار میں دو وقت اپنا اور بال بچوں کا پیٹ تک نہ بھر سکا۔ تھوڑی بہت شہرت تو مجھے ضرور مل گئی ہے۔ مگر دولت دوربین لگا کر دیکھنے سے بھی دور دور تک کہیں نظر نہیں آئی۔ آج تک جتنے کاغذ میں نے لکھ لکھ کر سیاہ کئے ہیں اگر انہیں ناشروں اور اخباروں و رسالوں کے مالکوں کی بجائے کسی کباڑیئے کو ردی کے بھاؤ ہی دے دیتا تو شاید ان لوگوں سے معاوضے کی نسبت کہیں زیادہ رقم وصول کر لیتا۔ ہمارے ملک میں ادیبوں کی تن اور من سے تو کبھی کبھی ضرور خدمت کی جاتی ہے۔ لیکن دھن کو ان کے قریب تک نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ انہیں دولت دیکھنے کو تو کیا سونگھنے تک کو نہیں ملتی شاید ناشر طبقہ انہیں فارغ البالی اس لئے میسر نہیں ہونے دیتا کہ مبادا وہ عیش پرستی میں پڑ کر کہیں لکھنا ہی نہ چھوڑ دیں۔ اس وقت میرے ذہن میں اپنے ملک کے ایک خوددار ناشر ورسالے کی کئی ناقابل فراموش یادیں گشت لگا رہی ہیں۔ سنیئے ان کی ادب نوازی کی ایک مثال سنئے اور پیروں بیٹھے اپنا سر دھنتے رہیے۔ ایک دفعہ ایک مشہور ناشر کے ہاں بغرض اشاعت کرنے پر میں ایک ناول لکھ کر ان کے پاس لے گیا۔ یہ ناول انہیں بہت ہی پسند آیا۔ اور

بعد شائع ہونے کے سبب قارئین سے بھی کافی سراہا۔ ناشر صاحب کئی مہینے ٹالتے رہے معاوضے کی ادائیگی کے بارے میں لیت و لعل سے کام لیتے رہے جب ان کے دفتر کے معشوق کے کوچے کی طرح کئی بار چکر کاٹ چکا تو ایک دن میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور میں نے جھلا کر پوچھا۔ "آپ کا ارادہ کیا ہے آپ معاوضے کی ادائیگی کیوں نہیں کرتے؟"

"کیسا معاوضہ؟ کون سی ادائیگی؟" ناشر صاحب بے رخی کے انداز میں پوچھنے لگے۔

"کیسی ادائیگی، ناول لکھنے کی .... اور کیسی"۔

"اجی صاحب" ناشر صاحب قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔ "معاوضہ تو ہمیں ملنا چاہیے جو آپ کی ہزاروں روپے کی پبلسٹی (publicity) مفت میں کر دی ہے۔ جناب ہم نے آپ کو گوشۂ گمنامی سے باہر نکال کر آسمانِ ادب کا ایک درخشندہ ستارہ بنا دیا ہے۔ ملک کے کونے کونے میں آپ کے نام کا ڈنکا بجوا دیا ہے۔ مگر آپ ہیں کہ ابھی تک معاوضے کی رٹ لگائے جا رہے ہیں ... خیر آئندہ جب کبھی آپ کوئی معیاری چیز لکھ کر لائیں گے تو آپ کو ضرور کچھ نہ کچھ معاوضہ دیا جائے گا۔ خاطر جمع رکھیں"۔

صاحبو! ادیبوں کی اس ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ کر میں آج برسرِ عام کھڑا ہو کر یہ چیز سر پر ہوتے لکھتا ہوں تاکہ لکھنے والوں کو جرأت حاصل ہو اور وہ کبھی بھولے سے بھی تو ادیب بننے کی جرأت نہ کریں۔ جنہوں نے [illegible] سرمایۂ ادب میں قدم رکھا تو [illegible]

ذہن میں اپنے درخشاں مستقبل کے متعلق ایک نہایت خوش نما اور
پرکشش تصور کے نمایاں نقوش ابھرتے رہتے ہیں۔ چھپا کر جلد ہی ہر اشتہار
ملک کے کونے کونے کے دیہات تک میں پہنچ جائے گا۔ پڑھے لکھے طبقے میں میرا نام
نہایت ہی احترام سے لیا جانے لگا۔ دولت اور شہرت کی دیویاں میرے
گھر کے باہر چپراسیوں کی طرح کھڑی ہو کر میرے احکام کا انتظار کیا کریں گی
مجھے راستہ میں چلتے پھرتے دیکھ کر لوگ اپنے ساتھیوں سے سرگوشیاں
کیا کریں گے "ارے پہچانا نہیں آپ نے۔ یہی تو ہیں ہمارے
ملک کے بڑے ادیب جن کی تحریروں نے سارے ملک کو اپنا دیوانہ بنا رکھا
ہے" وسیع ملک میں جگہ جگہ بے شمار ادبی انجمنیں مجھے اپنا سرپرست
بنوانے میں فخر محسوس کیا کریں گی۔ بڑے بڑے نقاد میری بلند پایہ تحریروں
سے مرعوب ہو کر میرے حق میں کہا کریں گے "میرے ہم وطن میری
تصنیفات کو پڑھ کر حقیقت میں بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ غیر ممالک کے لوگوں کا
ایک طبقہ بھی ان سے اثر لے سکیں گے" چنانچہ ہمارے ملک کے ایک
مصنف نے ادبی دنیا میں کیسے کیسے اچھوتے معیار قائم کیے ہیں۔ کیا
آپ کے کسی موجودہ یا سابقہ ادیب کی تحریریں ہمارے ملک کے اس طبقے کا
سنجوت کی تحریروں سے ٹکر لے سکتی ہیں؟"
مگر افسوس تھوڑے ہی عرصے کے بعد مجھے آٹے دال کا بھاؤ معلوم
ہو گیا۔ آٹے دال کا بھاؤ تو میں نے یوں ہی کہہ دیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے
کہ دیگر ضروری اخراجات مثلاً مکان کا کرایہ، بجلی اور پانی وغیرہ کے نرخ بھی مجھے

نمائی یاد ہو گئے ۔ میرے مستقبل کے قابل رشک ۔ خیالی محل کے ستون یک دم زمین پر آ رہے ۔ حقیقت چھپ نہ سکی ۔ صرف چند اپنے جیسے لوگوں کے علاوہ معتبر لوگوں میں میرا شمار ۔ معلوم ہوا کہ ہر شخص مجھے سمجھنے لگا ہے میں نے خود اپنے کانوں سے لوگوں کو اپنے متعلق سرگوشیاں کرتے ہوئے سنا "اس عقل کے دشمن نے اپنی زندگی تو اوٹ پٹانگ قصے کہانیاں لکھ لکھ کر برباد کر ہی دی تھی ۔ مگر ساتھ ہی اس نے اپنے بچوں کے مستقبل کا بھی ستیاناس کر دیا ہے ۔ اگر اس کے دماغ میں عقل کا کچھ سہارا مادہ بھی باقی ہوتا تو اسے اب جو کوئی چھوٹی موٹی دوکان کھول لینا چاہیے ۔ جس سے وہ تھوڑا یا بہت گزر اوقات کیوں نہ کرے ۔ اب کرنے سے بیکار کم از کم اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ تو بھر سکے گا" اگر میں اس وقت ان سمجھدار لوگوں کی قیمتی نصیحت پر عمل کر لیتا ۔ تو شاید آج میرا اتنا برا حشر نہ ہوتا ۔ عشق میرے دماغ سے [illegible] کا جنون نکل گیا ہوتا ۔ مگر اس وقت میری حالت سانپ کے منہ میں چھچھوندر جیسی تھی ۔ میں اپنی طبیعت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ادب دیو کے [illegible] سے باہر نہ نکل سکا ۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ میں خوشحالی کے پرسکون جزیرے پر رہنے کی بجائے قرضے کی خوفناک اور گہری دلدل میں دھنس گیا ۔ اب میرے ذمہ لوگوں کا اتنا قرضہ چڑھ ہوا ہے کہ یہ تو میرے پوتے پڑ پوتے بھی نہیں اتار سکیں گے ۔ ذرا کائنات کے سب سے بڑے مسخرے یعنی خدا کی مسخری طریقہ تو ملاحظہ ہو جس نے مجھے لوگ [illegible] شعور بار بار [illegible] اندر لوگوں کی تعداد [illegible] بدل چکی محمود [illegible] بہ قسمتی [illegible] کو بھی [illegible] اپنے روشن خیالات

سے دنیا کو تو منور کر سکتے ہیں۔ لیکن اسے اپنی عمر بھی مرتے دم تک اور
افلاس کی گھٹا ٹوپ تاریکی کو دور نہیں کر سکتے۔

میرے خیال میں تو اپنے ملک میں کسی شخص کے لئے خودکشی کرنے کا
سب سے مؤثر اور باعزت طریقہ یہی ہے۔ کہ وہ چپکے سے ادیب بن جائے
آہستہ آہستہ وہ اپنے معدے سے دوچار کئے رکھائے گا کہ ایک دن موت
کی دیوی اسے خود بخود اپنی بانہوں میں لے کر اپنی پرسکون آغوش
میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو جانے کی دعوت دے دے گی۔ اس قابل
رشک موت سے۔ کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہے۔ کہ ایسی خودکشی کرنے
والوں کو حکومت وقت بھی نہیں روک سکتی۔ کیونکہ اس کے جمہوری آئین
میں کوئی ایسی دفعہ نہیں ہے۔ جس کی بنا پر وہ ادب کے ذریعے شہید
ہونے والوں کو اپنی قانونی گرفت میں لے سکے۔

بھابھیو اب میرے لئے اس کے سوا کوئی اور چارا نہیں
رہا ہے۔ کہ میں اپنے بچوں کو کسی یتیم خانے میں داخل کروا سکنے کے
بعد چپکے سے موت کو خوش آمدید کہوں۔ مگر مرنے سے پہلے میں اپنے
بچوں کو یہ وصیت ضرور کر جاؤں گا۔ "بیٹا! چاہے تم دنیا کے کسی بھی
بڑے سے بڑے پہلوان کو للکار کر فری سٹائل کشتی لڑ لینا۔ خواہ
اکیلے ہی دنیا کے کسی بھی اونچے سے اونچے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی
کو سر کرنے کی خطرناک مہم پر چلے جانا۔ لیکن ادیب بننے کی بیوقوفانہ
حرکت کبھی نہ کرنا۔ خدا تم کو ہندوستان جیسے [illegible]۔

دوستو میری آخری خواہش یہی ہے کہ میری موت کے بعد میری قبر پر مندرجہ ذیل کتبہ کندہ کروا دیں۔ "یہاں اپنی تمام عمر کی بڑی تصنیفات سمیت ایک ایسا جاہل شخص مدفون ہے جس نے ادیب بننے کی خوفناک اور ذلت آمیز غلطی کی۔ خدا کرے کہ اس کی روح کو کبھی چین نہ ملے۔"

اس ستم رسیدہ ادیب کے لرزہ خیز حشر کو دیکھ کر میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے کم از کم اپنی زندگی میں اپنے کسی عزیز یا دوست کو ادیب بننے کی احمقانہ حرکت کبھی نہ کرنے دوں گا۔ شاعری، افسانہ نویسی، ناول نگاری وغیرہ تو بیکاروں کے شغل ہیں۔ عقل سے دور کا واسطہ رکھنے والوں کو بھی ایسی خام خیالیوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ ادیب تو وہ شخص بنے جس نے باپ دادا کی ثروت میں کافی روپیہ چھوڑ کر گھر بھرا ہو یا پھر اسے ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے لوٹ مار کا ایک معقول حصہ ملتا ہو۔

اِمتحان

میٹرک کا امتحان بن بلائے مہمان کی طرح دندناتا ہوا چلا آرہا تھا اور اِدھر ہم یہ سمجھتے تھے کہ ابھی ساری تیاری کرنا باقی ہے۔ امتحان میں صرف پندرہ دن رہ گئے تھے۔ مگر ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہماری کتابوں کے نام کیا کیا ہیں اور ان کے مصنف کون کون ہیں۔ تیاری کی بابت ہم اتنا ہی عرض کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ امتحان میں پاس ہونا تو درکنار ہم باعزت طریقے سے فیل بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ روز پکا ارادہ کرکے بیٹھتے تھے کہ آج لگاتار چودہ گھنٹے پڑھ کر ہی اٹھیں گے اس سے پہلے ہرگز نہیں چاہے دنیا میں قیامت ہی کیوں نہ آجائے۔ لیکن صاحب کہاں ہم اور کہاں

پڑھائی! ہم کچھ سوچتے تھے مگر ہوتا کچھ اور تھا۔ کبھی سب بے تکلف دوست آدھمکتے تو کبھی سینما کا پروگرام بن جاتا۔ کبھی موسم خراب ہوتا تو کبھی پڑھنے کا موڈ نہیں بنتا تھا۔ اگر خوش قسمتی سے کبھی یہ دونوں ٹھیک ہو جاتے تھے تو پھر صحت خراب ہو جاتی تھی۔ غرضیکہ پندرہ دن یونہی بے کار گزر گئے اور سولہویں دن ہم خدا کی ان دیکھی برکتوں پر بھروسہ کر کے امتحان دینے جا بیٹھے۔

پہلا پرچہ تاریخ کا تھا۔

پہلا سوال یہ تھا کہ قدیم آریوں کی تہذیب کے متعلق کیا جانتے ہو۔ ہم نے جواب میں لکھا "دیکھئے صاحب۔ ہم تو اس خیال کے حامی ہیں کہ بیسویں صدی یا زیادہ سے زیادہ انیسویں صدی سے پہلے دنیا میں کوئی تہذیب تھی ہی نہیں۔ ہم اس سے پہلے کی تہذیب (اگر آپ کے خیال شریف میں کوئی ہو) کو تہذیب کہہ ہی نہیں سکتے۔ بھلا آپ یہ تو سوچئے کہ جس زمانے میں ہوائی جہاز، ریل گاڑیاں، موٹر کاریں، ٹراموے، ٹیلی ویژن، ریڈیو، ٹیلیفون، سینما، کلب، ناچ گھر وغیرہ نہیں تھے۔ اس زمانے میں تہذیب دیکھنے کو تو کیا سونگھنے تک کو بھی نہیں مل سکتی ہوگی۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ آئندہ تاریخ کے پرچے میں قدیم تہذیب کے متعلق کسی قسم کا سوال نہ پوچھا جائے۔ کیونکہ اس سے پرچہ ڈالنے والے کی کم علمی اور جہالت ظاہر ہوتی ہے۔"

دوسرا سوال خاندانِ غلاماں کی بابت تھا ممتحن نے پوچھا تھا

اس خاندان کو نام خاندانِ غلاماں کیوں رکھا گیا۔ جس نے جواب دیا کہ سلطنت ملنے
غلاماں کے بادشاہوں کا نام دنیا کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جانے کے
قابل ہے۔ وہ سب سے پہلے بادشاہ تھے جنہوں نے دنیا میں جمہوریت سے لوگوں
شناس کروایا۔ آج کل کے حکمران اور سیاسی نیتا رجو ہے آپ کو جنتا کا خادم
سمجھتے نہیں تھکتے۔ مگر ان کے قول و فعل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خاندان غلاماں
کے بادشاہ صحیح معنوں میں عوام کے خادم یا آج کل کی زبان میں جنتا کے سیوک
تھے انہوں نے جو کچھ کہا کر کے دکھایا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے خاندان کا
نام خاندان غلاماں رکھا۔

اگلا سوال تھا کہ حیدر ہلدی گھاٹ میں راجپوتوں کی شکست کی کیا وجہ تھی۔ ہم نے
جو وجہ بتائی وہ یہ تھی۔ ہلدی گھاٹی کی لڑائی کے شروع میں راجپوتوں کا پلہ بھاری
تھا۔ جیسا ایک تاریخ دانوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ پلہ اتنا بھاری ہو
گیا تھا کہ اس کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہو رہا تھا۔ یہ مشہور زمانہ تاریخ
داں باگیشوری پرشاد لکھتا ہے۔ "پلہ اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ چند بہادر
راجپوت اس کے بوجھ کو تاب نہ لا سکے۔ اسی وجہ سے وہ ایک دم تو گر پڑے
گئے اور بہتوں کی ہڈیاں چور چور ہو گئیں۔" قریب تھا کہ مغل فوجیں شکست کھا
جاتیں۔ لیکن ان کے سپہ سالار کو ایک ترکیب سوجھ گئی۔ رات ہی رات میں سے
آناً فاناً ہلدی کی سینکڑوں بوریاں منگوائیں اور توپوں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ
دہلی کی ہاتھی منتقلی ہو چکی ہے جبکہ ہلدی گھاٹ کے نام سے
ہی ظاہر ہے۔ اور اللہ کا نام لے کر جنگ جیت کر فتح کروا دیں۔

اور انہیں حکم ہوا کہ وہ ہتھیار رکھ کر ناچ چھوڑ کر راجپوتوں کی آنکھوں میں جو بھی جھونکنا شروع کر دیں۔ یہ ترکیب کارگر ہوئی اور راجپوتوں کو شکست ہو گئی۔

آخری سوال لارڈ ڈلہوزی [illegible] کے بارے میں تھا۔ والد صاحبوں کا جواب اس وقت بھول گیا ہوں۔ امید ہے اس کے لئے آپ ہمیں معاف فرما دیں گے۔

دوسرے دن جغرافیہ کا پرچہ تھا۔ اس دن کے جوابات جو ہم نے دیئے ان کی بابت مختصراً عرض کرتے ہیں۔

سوال: "زمین گول کیوں ہے؟"

جواب: "اس کی مرضی!"

سوال: "بارش کس طرح ہوتی ہے؟"

جواب: "جب آسمان کا دل بھر آتا ہے تو وہ رو دیتا ہے بالکل انسانوں کی طرح۔ مگر بعض لوگ آنسوؤں کے ان قطروں کو بارش کے نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔"

نوٹ: لیکن یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اگر آسمان کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو وہ دھاڑیں مار کر روتا ہے مگر عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ آسمان بجلی کی گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش برسا رہا ہے۔ جب بوندا باندی ہوتی ہو پھر تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ آسمان محض شغل کے لئے یعنی تفریحاً رو رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ آسمان مگرمچھ کے آنسو [illegible] بہا رہا ہے!

سوال: (الف) ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش کہاں ہوتی ہے؟

(ب) بارش کا پانی کہاں جاتا ہے؟

جواب۔ (الف) مکانوں کی چھتوں پر۔

(ب) نالیوں میں۔

سوال: ۔چاند گرہن کے وقت کیا ہوتا ہے؟

جواب: ۔لوگ دان کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اشنان کرتے ہیں۔

جب ہم نے مگر ان جوابوں کی تصدیق کرنے کے لئے کتاب کھولی تو
فرطِ حیرت سے ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہاں ہم نے پڑھا کہ بارش
سورج کی گرمی سے پیدا شدہ بخارات کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ ہمارے آسمان کے
آنسو" والی تھیوری کے مطابق ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش مکانوں
کی چھتوں پر نہیں بلکہ آسام میں چراپونجی کے مقام پر ہوتی ہے۔ اور بارش
کا پانی نالیوں میں نہیں بلکہ ندی نالوں کے ذریعے سمندر میں جا پہنچتا ہے۔ دوسرا
کچھ زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ ہمارا چاند گرہن کے
سوال کا جواب بھی غلط ہے کیونکہ ممتحن کا اس سوال سے مقصد یہ تھا کہ
چاند گرہن کے وقت زمین، سورج اور چاند کی کیا حالت ہوتی ہے؟ اور
اس کا جواب یہ تھا کہ یہ تینوں گرہن کے وقت ایک دوسرے کی سیدھ میں آ
جاتے ہیں نہ کہ "لوگ اس وقت دان کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اشنان
کرتے ہیں"۔ کتاب یہ جوابات پڑھ کر ہمارے تعلیمی ذوق کو شدید

لگتیں لگی کیونکہ کتاب میں لکھے ہوئے جوابوں کی نسبت ہمارے جواب زیادہ معقول تھے۔ اس لیے اس دن سے جغرافیہ کی کتاب پر سے ہی نہیں بلکہ جغرافیہ پر سے بھی ہمارا یقین اٹھ گیا ہے۔

ہمارا نقشہ بھرنے کا سوال بھی بہت غلط انک طور سے حل ہوا تھا۔ نقشے میں ریلوے لائن، دریا اور نہریں کچھ عجیب طرح سے خلط ملط ہو گئی تھیں۔ غور سے دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ ریلوے لائن جو دہلی سے کلکتہ جاتی تھی وہ کلکتہ سے ہوتی ہوئی خلیج بنگال میں جا گرتی تھی۔ کچھ دریا عین شہروں کے بیچ میں سے گزر رہے تھے۔ گنگا دریا کا تو رخ ہی بدل گیا تھا۔ جن میدانوں میں ہم نے پہاڑ بنا دیئے تھے، جس جگہ کپاس کی کاشت ہوتی تھی وہاں ہم تمباکو لکھ آئے تھے۔ جہاں پٹ سن ہوتی تھی وہاں ہم ربڑ کے درخت اگا آئے تھے اور سب سے سنگین غلطی ہم سے یہ ہوئی کہ ایک صحرائی علاقے میں آسام کی فصل لگا آئے تھے۔

ان سب باتوں کو دیکھ کر ہمیں تو یہ ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں پنجاب یونیورسٹی ہمیں ماہرین جغرافیہ سمجھ کر ہی نہ کہے جغرافیہ کی مجلس کا ایک نیا جغرافیہ لکھنے کی دعوت نہ دے دے!

اس کے بعد حساب اور اس کے بال بچوں یعنی الجبرا اور جیومیٹری کا امتحان تھا۔ دنیا کے تمام خشک مضامین میں سب سے زیادہ چڑ ہمیں اس حساب اور اس کے خاندان (الجبرا، جیومیٹری وغیرہ) سے ہے۔ اپنا خیال تو یہ ہے کہ ایک عام آدمی کا ...... کا علم حساب سے تعلق اتنا ہی

ہونا کافی ہے۔ کہ وہ رقموں کو جمع و تفریق اور تقسیم کر سکے۔ وہ اپنی تنخواہ
کا حساب رکھ سکے اور کسی دوکاندار کو نوٹ دے کر باقی ریزگاری ٹھیک طرح
سے گن کر لے سکے .... مگر کوئی ذواضعاف اقل اور کسر اعشاریہ کا
نام سنتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم جیسے خطرناک اور لاعلاج بیماری میں مبتلا
ہو رہے ہیں۔ اور دیکھئے .... لفظ الجبرا کس قدر
وحشت ناک ہے۔ الجبرا کا نام سنتے ہی جسم میں ایک قسم کی کپکپی چھوٹنے
لگ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریچھ یا پہاڑ کی قسم کا کوئی خوفناک
درندہ اپنے بھیانک جبڑے کھولے ہوئے ہم کو نگلنے کے واسطے ہماری طرف
لپکتا ہوا چلا آ رہا ہے۔

اس کے بعد جیومیٹری کا امتحان تھا۔ انگریزوں کے بچے پڑھنے کے بعد
کی بدولت تو ان مضامین کو پڑھنا غیر ضروری اور فالتو سمجھتے ہیں۔ اس لئے
ہم نے ان مضامین کی طرف توجہ دینا ہی چھوڑ دی ہے۔ اس مضمون کے
پرچے ہم نے کیسے حل کئے ہوں گے۔ اس کی بابت آپ خود ہی اندازہ
لگا سکتے ہیں۔

اس کے بعد اردو کا امتحان آیا۔ چونکہ یہ ہمارا پسندیدہ مضمون تھا
اس لئے ہم اس کے پرچے بہت ہی عمدہ طریقے سے حل کرتے تھے
پہلے سوال میں چند محاورات کی گردان شعارت دی ہوئی تھی اور باقی کی ہمیں
لکھنی تھی۔ ہم صفحہ نہیں لکھے پر بھا۔
تیل کا کھاؤ دیکھو .... ہم تیل دیکھو

۲ - نہ نو من تیل ہوگا .... نہ پکوڑے تل ہونگے۔

۳ - ایک کریلا .... اور وہ بھی سڑا ہوا

۴ - بغل میں چھری .... منہ میں خوش آمدید

۵ - ناچ نہ جانے .... چلے کلب کو

دوسرا سوال یہ تھا کہ تم خواجہ حالی کی بابت کیا جانتے ہو۔ نیز ان کی شاعری پہ تنقید سے روشنی ڈالو۔ اس سوال کا جواب یوں دیا گیا۔
خواجہ حالی دراصل دوکاندار ہوا کرتے تھے جیسا کہ ان کے اپنے ہی ایک شعر سے ظاہر ہے۔

حال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

اس سے اور اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ خواجہ حالی ایک کہنہ مشق اور تجربہ کار دوکاندار تھے اور شاعری نوابی کا سائڈ بزنس تھا۔ جسے وہ تفریحاً شعر کہہ کرتے تھے۔

ان کی شاعری کی بابت عرض ہے کہ سب سے پہلے اور سب سے آخر ہمیں ان کا تخلص پسند نہیں ہے۔ حالی ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے خالی چھوڑ دیا ہے کیونکہ دونوں الفاظ ہم وزن ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ اپنا تخلص مالی رکھ لیتے تاکہ ان کے حالی تخلص کی وجہ سے ان کے شعروں میں جو خالی پن آگیا ہے۔ اس کی کمی مالی تخلص رکھنے سے پوری طرح دور ہو جاتی۔ خود آپ خیال تو کیجئے کہ اگر کسی شخص کا تخلص

مالی ہو تو ہمیں خواہ مخواہ یقین ہونے لگتا ہے کہ اس شخص کی شاعری میں مزید
پھولوں کی رنگینی، شوخی اور لطافت موجود ہوگی۔ بادِ بہاری کی اٹکھیلیاں
ہوں گی اور بھنوروں اور تتلیوں کا رقص ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

آخری سوال جواب مضمون کا تھا۔ ہم نے جو مضمون منتخب کیا اس
کا مضمون تھا "امتحان .... اس کے فائدے اور نقصانات"۔

پہلے تو ہم نے چند فقروں میں امتحان کی تشریح کی اور اس کے بعد امتحان کے
مندرجہ ذیل چند فائدے بیان کیے۔

گھر والے کوئی کام کرنے کو نہیں کہتے۔ اگر وہ غلطی سے کہہ بھی دیں تو
بلا جھجک ان پر ٹیسٹ پیپر سوار ہو جاؤ اور انہیں انھیں دکھا کر کہو۔
" دیکھتے نہیں میرا امتحان ہونے والا ہے"۔ پتہ نہیں ان الفاظ میں
کیا جادو ہے کہ انہیں سنتے ہی گھر والے موسم کی طرح بدل جاتے ہیں۔
شاید وہ سمجھتے ہیں کہ برخوردار کا امتحان نہیں بلکہ کوئی خطرناک آپریشن
ہونے والا ہے۔ اس لئے اسے کسی کام کرنے کی بابت نہیں کہتا جاتا
یا کوئی ایسی سخت بات نہیں کہی جاتی جس سے کہ اس کی صحت
پر برا اثر پڑے۔

۲- امتحان دینے والے کی ٹھیک اسی شخص کی طرح خاطر تواضع کی جاتی
ہے جس نے کسی معتبر شخص کے مقدمے میں گواہی دینے جانا ہو
گھر والے طرح طرح کے لالچ دیتے ہیں جیسے کہ اگر تم امتحان میں
پاس ہو جاؤ گے تو تمہیں یہ دیں گے، وہ دیں گے

میں کشمیر بھیج دیں گے وغیرہ وغیرہ ۔

۳ ۔ اگر امتحانوں کا کاروبار نہ ہو تو دنیا کی تمام یونیورسٹیوں کے بھلے نکل جائیں اور پرچے بنانے والے اور پرچے دیکھنے والے پروفیسروں اور ماسٹروں کی آمدنی کا معقول ذریعہ ختم ہو جائے ۔

۴ ۔ اگر امتحان نہ ہوں تو گائیڈ اور خلاصے لکھنے والے نام نہاد عالم پروفیسروں کو زبردستی بھوک ہڑتال کرنی پڑ جائے ۔

یہ تو تھے امتحان کے فائدے ۔ اب ذرا اس کے نقصانات کے بارے میں بھی سن لیجیے ۔

۱ ۔ امتحان ایک طرح کا وبائی مرض لاتا ہے جسے عام اصطلاح میں "امتحانی بخار" کہتے ہیں ۔ امتحان کے دنوں میں ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپل صاحبان کے پاس اس بیماری کا شکار ہونے والے مریضوں کی اکثر عرضیاں آتی ہیں ۔ یہ بخار صرف طالب علموں کو ہی ہوتا ہے ۔ اور وہ پلک جھپکنے میں اس کی گرفت میں آ جاتے ہیں ۔ اس بخار کی تاثیر مختلف ہوتی ہے ۔ مریض کو بظاہر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ [illegible]

۲ ۔ امتحان دینے والوں کی دماغی طاقت تو قدرے رکھتی ہیں مگر حساب لینے والوں کا بالکل ستیاناس ہو جاتا ہے ۔ امتحانوں کی وجہ سے دنیا کی مجموعی صحت پر نہایت ہی برا اثر پڑا ہے ۔ انسانیت کا جتنا خون امتحانات نے چوسا ہے اتنا تو شاید دنیا کی پہلی اور دوسری عالمی جنگوں نے بھی نہ چوسا ہو گا ۔ اسی لیے انہیں بڑے

افرات کو دیکھ کر ہندوستان کے مشہور شاعر جناب غالب نے فرمایا ہے

؎ امتحان نے غالب نکما کر دیا ۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پہلے تو لوگ کہتے تھے کہ تم تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو مگر آج کل سننے میں آتا ہے کہ تم تو امتحان کی طرح میرے پیچھے پڑے ہو جتنی تکلیف اور ایذا طالب علموں کو امتحان سے ہوتی ہے وہ بیچارے معصوم طالب علم ہی جانتے ہیں ۔ امتحانوں کی اسی تکلیف سے تنگ آ کر ایک دل سوختہ طالب علم شاعر جناب طوق نے فرمایا ہے ۔

؎ اے طوق امتحان میں ہے تکلیف سراسر
ہیں آرام سے وہ جو امتحان نہیں دیتے

حضرت یسوع مسیح نے بھی فرمایا ہے کہ "اے خدا مجھے ہر قسم کی مصیبت میں ڈال دینا لیکن امتحان کی مصیبت میں میرے دشمن کو بھی نہ ڈالنا" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانیت کے اتنے بڑے پیغمبر کو بھی امتحانوں کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے اور وہ بھی امتحان سے پناہ مانگتے ہیں ۔

غرضیکہ امتحان ایک مصیبت ہے ایک وبا ہے ، ایک لعنت ہے اس سے طالب علموں کی ہر ممکن روک تھام ہونی چاہیئے امتحان میں بڑی بڑی ہستیوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں ۔ پتہ نہیں ابھی تک انجمن اقوام متحدہ کی توجہ امتحانوں کے خطرے کی طرف کیوں نہیں ہوئی ہمارے خیال میں تو تمام سکولوں اور کالجوں کی یونیورسٹیوں ۔ سپرنٹنڈنٹ امتحان کو چاہیئے

کو امتحانوں کے مکمل خاتمے بارے میں قرارداد پاس کر کے یو۔ این۔ او
کے پاس اس التجا کے ساتھ بھیج دیں کہ اس ریزولیوشن کو اتحادی سبھا کے ایجنڈ
میں سب سے پہلے رکھیں کیونکہ دنیا کو اس وقت جو سب سے بڑا خطرہ درپیش
ہے۔ وہ تیسری ڈرائنگ کا نہیں بلکہ امتحان کے مسئلہ کا ہے۔

ہمیں امتحان کے خلاف صرف ریزولیوشن پاس کر کے ہی آرام سے
نہیں بیٹھ جانا چاہیئے بلکہ ہمیں نہایت مستعدی سے کام لیتے ہوئے امتحان
کے خلاف دنیا کے طلبا کی رائے عامہ کو بیدار کرنا چاہیئے تاکہ وہ سب ایک
آواز ہو کر اپنے مطالبہ کے لئے ڈٹ جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے
دنیا کے تمام طالب علموں کے نمائندوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد
ہونی چاہیئے اور دنیا کے تمام ملکوں میں جلوس اور جلسے ہونے چاہئیں
ان جلوسوں میں کچھ اس قسم کے نعرے لگنے چاہیئے "نہیں چلیں گے
امتحان" "ختم کر کے رہیں گے ......" "امتحان چاہے نکل جائے
ہماری جان ......نہیں دیں گے امتحان"

ہماری شادی

۔۔۔۔ یوں تو ہماری شادی کا معاملہ ایک طویل عرصے سے دوست
واحباب اور رشتہ داروں کے لئے گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا مگر پچھلے سال سے
تو یہ خطرناک طور پر شدت اختیار کر گیا۔ جو کوئی ملتا رسمی طور پر حال چال پوچھنے
کے بعد شادی کے متعلق تذکرہ چھیڑ دیتا۔ کوئی دوست ملتا تو کہہ دیتا تم کیوں
اب شادی عمر بھی برہمچاری رہنے کا ارادہ ہے چھبیس سال کے تو ہو چکے
اب کون سے وقت کے انتظار میں ہو کیا برٹرنڈ رسل کی طرح چوراسی سال کی
عمر میں شادی کرنے کا ارادہ ہے؟ کوئی رشتہ دار ملتا تو کہتا خواہ مخواہ
انتظار کروا رہے ہو۔ اپنی شادی کے لئے تمہارے دوستوں کے تو تین تین
بچے ہو چکے ہیں۔ جب ان کے بچوں کے بچے پیدا ہو جائیں گے تو کیا اس وقت شادی کرو گے۔

میرے خیال میں وہ وقت شادی کے لئے نہایت موزوں رہے گا تاکہ لوگ تمہارے پوپلے چہرے پر سہرا بندھا ہوا دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھیں۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام"

ایک اور بے تکلف دوست یوں فرماتے "۔ ارے یار تمہارے دوستوں کی دھڑا دھڑ شادیاں ہو رہی ہیں۔ مگر تم ایسے ڈھیٹ ہو کر تمہیں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی رتی بھر شرم نہیں آتی۔ اگر کسی لڑکی کو باقاعدہ برات لے جا کر پھیرے دلوا کر بیاہ نہیں لا سکتے تو کسی کو ویسے ہی بھگا کر لے آؤ۔ ہم سمجھ لیں گے کہ تمہاری شادی ہو گئی۔ اور وہ بھی بغیر کسی خرچ کے ہو گئی۔

ایک اور قریبی رشتہ دار اپنے مخصوص انداز میں ناک سے آواز نکال کر فرماتے "میرے خیال میں تو اب بیسویں صدی میں تو تمہاری شادی ہونے سے رہی۔ اکیسویں صدی کا کوئی ساہا نکلواؤ۔ اکیسویں صدی میں اگر شادی ہو گئی تو یہ سمجھ کر انتظار کرو کہ شادی کے لئے مقررہ دن کا خیال کر کے ماں، دل کو تسلی ملتی رہے گی"۔ ہماری برادری کی ایک ضعیفہ بالوں والی خاتون عجیب کہاوتیں یہی فرماتی ہیں — برخوردار۔ تمہارے سنجوگ تو بہت ہی ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے سنجوگ ہوائی جہاز کی طرح تیزی سے اڑ رہے ہوتے ہیں مگر یہاں تمہارے سنجوگ سست رفتار اور اڑیل بیلوں سے جتے ہوئے چھکڑے کی طرح آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کئی دفعہ تمہیں سمجھا چکی ہوں۔ مگر تم ایک دفعہ اتوار کے دن کسی مندر میں

دو جوڑیاں (جھاڑو) چڑھا کر تو دیکھو کہ تمہارا بیاہ کتنی جلدی ہوتا ہے
مگر آج کل کی نئی تہذیب نے تمہارے دماغ کو اس قدر خراب کر دیا ہے
کہ تم میری بات کو وہم سمجھ کر اسے مانتے ہی نہیں"

ہم اپنے ملنے جلنے والوں کو بہترا سمجھاتے کہ دیکھو لوگ تو کہتے ہیں کہ
مصیبت اکیلی نہیں آتی۔ بلکہ اپنی تفریح طبع کے لئے اپنی ہی سہیلیوں کو بھی
ساتھ لے آتی ہے اسی طرح شادی کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے۔ کہ بیوی جب
بھی آتی ہے اکیلی نہیں آتی۔ بلکہ اپنے دل بہلاوے کے لئے کافی بال بچے بھی
ساتھ لے آتی ہے۔ اگرچہ یہ بچے شادی کے کچھ عرصہ بعد باری باری اپنے
ننھے ننھے مکھڑے دکھلانا شروع کرتے ہیں۔ مگر آتے تو بیوی صاحبہ کی آتا
وجہ سے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مجرد شخص کی زندگی کتنی پُر لطف اور سکون
آمیز ہے۔ نہ بیوی بچوں کا جھگڑا نہ راشن پانی کا فکر۔ جب جی چاہے گھر
واپس آجاؤ اور جب جی چاہے گھومنے پھرنے کے لئے باہر نکل جاؤ۔ کوئی روکنے
ٹوکنے والا نہیں۔ مگر بیوی اور بال بچوں والوں کو یہ آزادی کہاں۔ بس سائیکل کے
پہیے کی طرح گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر۔ اگر کہیں ایک آدھ گھنٹہ کے لئے
اِدھر اُدھر ہو جاؤ تو تفتیش شروع ہو جاتی ہے۔ باقاعدہ صفائی
کا بیان دو اور جھوٹی سچی قسمیں کھاؤ تب جا کر کہیں چھٹکارا نصیب
ہوتا ہے اور پھر جیسے ستائیس سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے ہمارے
شاستروں نے پچیس سال کی عمر کے بعد ہی شادی کروا دینے کو
فرماتے ہیں شادی کرنے کی اصلی عمر تو ہمارے جیسے آدمیوں کی

پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے ملکوں میں شادیاں عموماً پچیس میں سال کی عمر میں ہوا ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس عمر میں آدمی زیادہ سمجھدار، وسیع النظر اور تجربہ کار ہو کر گھر گرہستی کے اہم بوجھ کو سنبھالنے کے قابل ہوتا ہے۔

مگر ہماری دلیلوں کا گھر والوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لوگوں کو ایسی باتیں کرتے دیکھ کر ہمیں یہ شک ہی نہیں بلکہ پختہ یقین ہو گیا کہ اس وقت دنیا کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ امن عالم کے قیام کا نہیں بلکہ ہماری شادی کا ہے۔ اس خیال کے آتے پر ہم نے بھی یہ فیصلہ کر ہی لیا کہ اگر اپنے سے نہیں تو کم از کم دنیا کا منہ بند کرنے کے لئے اب شادی کر ہی ڈالیں۔ آخر ہم نے گھر والوں کو یہ الٹی میٹم لکھ کر دے ہی دیا۔ "اگر آپ نے آج سے لیکر ٹھیک دو ماہ کے اندر اندر ہماری شادی نہ کروائی تو ہم یقیناً کسی نہ کسی لڑکی کو اغوا کر کے لے ہی آئیں گے پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی"۔ اس سنسنی خیز الٹی میٹم کو پڑھ کر ہمارے گھر والوں کے ہاتھوں کے ہاتھی اڑ گئے۔ کیونکہ طوطے بیچارے تو بہت ہی حقیر اور چھوٹے سے جانور ہیں۔ اور اگر وہ کسی کے ہاتھوں سے نکل جائیں تو اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا کہ ہاتھی نکل جانے کا ہمارے گھر والے خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ کہ ہم جیسا معصوم سا خورد اور ادب کا پتلا اتنا خطرناک اور انقلابی اقدام اٹھا سکتا ہے۔

قصہ کوتاہ پندرہ دن کے اندر اندر ہماری سگائی ہو گئی اور الٹی میٹم میں تحریر شدہ دو ماہ کی مدت کی بجائے ایک مہینے کے بعد ہماری شادی

ہو جو گئی۔ خوش قسمتی سے لڑکی بھی اچھی خوبصورت اور ذہین ملی۔ اگرچہ سابقہ حالات کے پیش نظر ہمیں تو اندھی۔ کانی۔ لولی لنگڑی لڑکی جیسی بھی ملتی منظور تھی۔ ہمیں تو فقط لڑکی نام کا جنس کا ایک عدد دانہ چاہئے تھا۔ وہ بھی لوگوں کی زبان کو علی گڑھ کا پختہ تالا لگانے کے لئے۔

خیر ہماری شادی ہو گئی اور ہوئی بھی کمال دھوم دھام اور شان و شوکت سے۔ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم نے پانی پت کی چوتھی لڑائی (کیونکہ پہلے تین ہو چکی ہیں) جیت لی ہو۔ اگر شادی دنیا کی تاریخ کا اہم واقعہ نہیں تو کم از کم ہندوستان کی تاریخ کا ناقابل فراموش واقعہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ بارعب وردی پہنے ہوئے باجہ بجانے والوں کے پیچھے اور قیمتی پوشاکیں پہنے ہوئے براتیوں کے آگے ایک بہترین ساز و سامان سے آراستہ پیراستہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے ہم اپنے آپ کو ایک ایسا فاتح جرنیل تصور کر رہے تھے۔ جس کو نہایت شاندار فتح ملنے پر فوجی بینڈ کے پیچھے اور بارعب وردی میں ملبوس فوجوں کی قطاروں کے آگے پوری شان و شوکت سے گھوڑے پر سوار کر کے اس کے اعزاز میں شاندار جلوس نکالا جاتا ہے۔ برات کے آگے جو بینڈ والے باجے تھے ان کے دھماکوں کی شدت ہمارے سلامی کے وقت توپوں کے گولوں کی شدت سے کم نہیں تھی۔ ہمیں بیوی کے ملنے کی اتنی خوشی نہیں ہو رہی تھی جتنی کہ لوگوں کی زبانیں بند ہونے کی۔

مگر افسوس کہ ہماری یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی جب ہماری شادی

ہوئے ڈیڑھ دو سال گزر گئے۔ تو دوستوں، واقف کاروں اور رشتہ داروں نے اولاد کے متعلق پوچھنا شروع کر دو۔ جو کوئی بھی ملتا بڑی حیرانی سے کہتا۔

"ارے! شادی کو دو سال ہو گئے۔ مگر بچہ ایک بھی پیدا نہ ہوا۔ اچھے مرد ہو!" یہ کہہ کر وہ ہماری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتا۔ جیسے اسے ہماری حالتِ زار پہ بے اختیار ترس آ رہا ہے۔ ہم بہتیرا سمجھاتے کہ اے بندۂ خدا! کیا ہوا جو ہمارے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ آگے ہی کیا ہند میں بچوں کی کوئی کمی ہے۔ جو ہم ان کی تعداد میں برساتی مینڈکوں کی طرح اضافہ کرتے پھریں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ پہلے کی طرح اگلی دفعہ پھر اناج کے کنٹرول کا خوفناک بھوت ہمارے سروں پر منڈلانے لگے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم بے تحاشہ بچے پیدا کر کے ملک میں پھیلی ہوئی بھیانک بے کاری کو اور بھی بڑھا دیں؟"

ہماری یہ باتیں سن کر دوسرے صاحب بڑے طمطراق سے فرماتے کہ: "اجی تمہارے بچے نہ پیدا کرنے سے ملک کی آبادی میں کون سی کمی ہو جائے گی۔ تم زیادہ سے زیادہ چار نہیں تو پانچ بچے پیدا کرو گے۔ سو اس سے بڑھ کر اور کون سا تیر مار لو گے۔ کتنا روشن بچا لو گے ملک کا۔ کتنی کمی کر دو گے بے کاری میں؟"

"چاہے پانچ چھوڑ دس بچے پیدا کرو" ہم نے جواب دیتے ہوئے کہا "مگر سوال ہمارا تعداد کا نہیں۔ اصول کا ہے۔ اگر ہم اسی طرح اور لوگ بھی برتھ کنٹرول کے اصولوں پر عمل کریں تو وہ ملک کی بہترین خدمت

کر سکتے ہیں۔ سب لوگوں کی مشترکہ کوششوں سے ہی کامیابی مل سکتی ہے۔

مگر دوسرے صاحب کو ہماری باتیں پسند نہ آتیں۔ اور بعض دفعہ تو وہ مجھ سے ہاتھ ملائے بغیر ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے منہ سے [illegible] گالیاں نکالتے ہوئے) اپنا راستہ ناپتے ہوئے نظر آتے۔

ایک اور صاحب ملے۔ اور یوں فرمانے لگے "بھئی حد ہوگئی۔ اجی آپ ایک بچہ بھی پیدا نہیں کرسکے۔ میری طرف دیکھیے۔ میرے بیاہ کو [illegible] چار سال ہوئے ہیں مگر نو بچے ہیں اور وہ بھی سب زندہ" یہ سن کر جب اپنے کانوں کی صحت پر شک ہونے لگا۔ گھبراتے ہوئے پوچھا "چار سال میں نو بچے"

"جی ہاں! وہ بھی سب زندہ سلامت ہیں" انہوں نے با آواز بلند اعلان کیا حیرانی کے عالم میں ہمارے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے۔ "تو کیا یہ سب آپ کے ہی بچے ہیں؟"

"میرے بھیا تو کیا آپ کے ہیں" انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا

"........ کیا مطلب ہے جی آپ کا؟" "مطلب یہ ہے کہ یہ سب بچے آپ کے ہی ہیں یا آپ کی بیوی صاحبہ انہیں میکے سے ساتھ لائی ہیں"

"دیکھیے میرا مطلب یہ ہے کہ کبھی ہماری بیوی نے دو دو بچوں کو ایک ساتھ جنم دیا اور کبھی تین تین کو"

ان کا یہ سنسنی خیز جواب سن کر ہمیں بے اختیار رانی لگی مالی اُس کتیا کی یاد آگئی۔ جس نے چھ پلّوں کو ایک ساتھ جنم دیا تھا۔

مگر جب ہماری شادی کے بعد تین سال گزر گئے۔ تو ہمارے بچہ پیدا ہی نہ

پیدا نہ کرنے کے ارادے کو بدلنا ہی پڑا۔ شادی کے معاملے کی طرح اب ہمارے بچے نہ پیدا ہونے پر لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے تھے۔ ہندوستان بھی خوب ملک ہے۔ اگر یہاں کسی شخص کے ہاں اس کے بیاہ کے ٹھیک نو مہینے بعد تک کوئی بچہ پیدا نہ ہو تو اکثر لوگ اس کی قوت مردمی پر بھی شک کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

تین چار مہینے گزرنے کے بعد ہم نے بھی نہایت فخر سے اعلان کرنا شروع کر دیا کہ بفضل خدا ہمارے ہاں بھی بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ یہ سن کر ہمارے کئی دوستوں، واقف کاروں اور رشتہ داروں کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی کیونکہ وہ ہمیں "ناکارہ" سمجھ کر ہمارے ہاں بچہ پیدا ہونے کی امید بھی چھوڑ چکے تھے۔ انہیں اس وقت تک ہماری بات پر یقین نہ آیا جب تک کہ انہوں نے خود ہمارے گھر پر آنے والی نرس اور لیڈی ڈاکٹر سے اس امر کی تسلی نہ کر لی۔ بس اب کیا تھا، پیشگی مبارکباد دی جانی شروع ہو گئیں۔ ایک دوست صاحب سے ہم نے مبارکباد دینے کی وجہ پوچھی تو فرمانے لگے۔ فارسی زبان کی ایک کہاوت ہے "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد" لیکن زمین ہل گئی لیکن گل محمد صاحب اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ ہم آپ کو یہ مبارکباد اس لیے دے رہے ہیں کہ آج ایک گل محمد اپنی جگہ سے ہل گیا ہے۔ یعنی اس نے اپنے بچے نہ پیدا کرنے والے ارادے کو بدل دیا ہے اور اس سے بھی بچہ پیدا ہونے کی امید ہے"۔

"یہ بات نہیں تھی" ہم نے ہنستے ہوئے کہا "میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ اپنی حیثیت کے مطابق مناسب وقت پر بچے پیدا کرنے چاہئیں"۔

"اجی چھوڑیئے آپ اس فضول کی نصیحت بازی کو" ہمارے دوست فرمانے لگے۔ "ہونے دو جو ہوتا ہے بچے تو خدا کی دین ہیں۔ جو پیدا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر ہی لیتا ہے۔"

"جی ہاں! چاہے اسے گندگی کے ڈھیر سے ہی کیوں نہ خوراک ڈھونڈنی پڑے۔" ہم نے ان پر طنز سے بھرپور چوٹ کی اور وار کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس چوٹ کی شدت کو برداشت نہ کر سکے۔ اور بات کا رخ پلٹاتے ہوئے کہنے لگے

"اچھا یہ تو بتاؤ۔ کہ تمہارے ہاں لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی؟"

"بھئی میں یہ کیسے بتا سکتا ہوں۔ قدرت کی مرضی ہے چاہے لڑکی ہو جائے یا لڑکا۔"

"ارے یار لڑکے کی دعائیں مانگو۔ اگر لڑکی پیدا ہوئی تو مفت کی ڈگنا بھرنی پڑے گی۔ میں تو خدا سے ہمیشہ یہی دعا کرتا رہا ہوں کہ میرے گھر لڑکی نہ ہو۔ پالو پوسو اسے پڑھاؤ لکھاؤ اور جب وہ جوان ہو جائے تو پھر اس کے بیاہ کے لئے موزوں ور ڈھونڈو اور جہیز اکٹھا کرنے کی فکر میں خود کو غرق کرتے پھرو۔

"خدا بچائے ایسی منحوس جنس سے۔"

"یہ بڑے افسوس کی بات ہے" ہم اپنے دوست کی پست ذہنیت کا ماتم کرتے ہوئے بولے۔ "کہ آپ جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی لڑکیوں کو منحوس خیال کرتا ہے۔ دراصل آپ جیسے لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں۔ کہ اگر یہ "منحوس" جنس دنیا میں نہ ہوتی تو آپ لوگ بھی اپنی ماں کی کوکھ سے جنم لے کر ہرگز ہرگز

اس دنیا میں تشریف نہ لاتے۔ باقی رہا جہیز کا سوال تو یہ آپ کی اپنی ہی بنائی ہوئی رسم ہے۔ خدا نے تم ضرور بہیں دی۔ اگر آپ کو یہ رسم بری لگتی ہے تو نہ آپ اپنے لڑکوں کے بیاہ میں جہیز لیں۔ اور نہ اپنی بہنوں اور لڑکیوں کے بیاہ میں جہیز دو۔"

"ارے بھائی تم تو بات بات پر نصیحت کے لیکچر پلانے لگے۔ جانے دو" میرے یار نے دوسرے کھسیانی سی ہنسی ہنس کر موضوع کو پھر پلٹ دیا اور کہنے لگے "مگر میں یہ شرط لگا کر کہتا ہوں۔ کہ تمہارے ہاں لڑکے ہی پیدا ہوں گے"

"وہ کیسے؟"

"یوں کہ اپنا تجربہ یہی کہتا ہے۔ تمہارے جیسے نصیحت باز اور نرم دل لوگوں کے ہاں لڑکیاں ہی پیدا ہوتی ہیں۔

لڑکے تو ہم جیسے مرد ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو لگاؤ شرط۔"

"لو چلو لگ گئی۔"

"کتنے کی؟"

"جتنی تم کہو۔"

"لو پھر سو سو روپے کی ہی۔"

"منظور!" ہم نے اپنے دوست کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں میں اگر ہوئی۔ اس شرط کی بابت سن کر ہمارے کئی دوستوں

اور واقف کاروں کی بھی آپس میں نئی شرطیں لگ گئیں جن کی مجموعی رقم کئی ہزار کی تعداد تک جا پہنچی ۔ کوئی کہتا تھا لڑکی ہو گی اور کوئی لڑکا ۔ روز بروز بحث تیز ہوتی رہی ۔ نئی نئی شرطیں لگتی رہیں ۔ پرانی شرطوں کی رقم بڑھتی رہی اور ہمارے ہونے والے بچے کی پیدائش کا وقت نزدیک آتا گیا ۔

آخر وہ دن آ ہی گیا ۔ ادھر گھر کے اندر نرسیں اور سپیشلسٹ ڈاکٹر اپنے کام میں مصروف تھیں ۔ اور ادھر گھر سے باہر لوگ اپنی بحث میں لڑکے اور لڑکی کی دھن پر اندھا دھند لگائی جا رہی تھی ۔ جوں جوں بچے کی پیدائش کا وقت نزدیک آتا گیا توں توں شرطیں لگانے والوں کی بحث بھی تیز تر ہوتی جا رہی تھی ۔ ان لوگوں کو آپس میں الجھتا دیکھ کر آس پاس کے گلی محلے اور بازاروں والے لوگ بھی تماشہ دیکھنے کے لئے ہمارے محلے والے میدان میں اکٹھے ہونا شروع ہو گئے ۔ اور ان کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچی ۔ پرانی شرطیں لگانے والوں کے جوش کو دیکھ کر تماشائیوں نے بھی آپس میں شرطیں لگانا شروع کر دیں ۔ بحث اور بھی گرم ہو گئی اور گرم ہو کر کھولنے لگی ۔ شور و شرابہ اور بھی بڑھ گیا ۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمارے گھر کے اندر کسی بچے کی پیدائش نہیں ہو رہی ۔ بلکہ ڈربی کی لاٹری کے ٹکٹ نمبر نکالے جا رہے ہیں ۔

گھر کے اندر سے لیڈی ڈاکٹر بار بار یہ پیغام بھیج رہی تھی کہ شور و غل اور بحث مباحثہ بند کرو ۔ کیونکہ ان کے کام میں رکاوٹ ہو رہی تھی مگر گھر کے باہر لوگوں کے درمیان جو بحث گرم ہو کر کھولنے لگی تھی ۔ اب ابلنے

شروع ہو گئی۔ پہلے پہل تو اس بحث کا دائرہ صرف چند شستہ الفاظ تک ہی محدود
تھا مگر اب کہیں کہیں گالی گلوچ تک بھی نوبت آ پہنچی تھی۔ جن صاحب سے
ہماری شرط لگی ہوئی تھی۔ وہ زور سے گرج کر بولے "لڑکی ہی پیدا ہوگی"

"ہرگز نہیں۔ لڑکا ہی ہوگا"۔ ان کے مخالفین نے چلّاتے ہوئے کہا۔

"میں پھر کہتا ہوں اور ہزار بار کہتا ہوں" ہمارے دوست نے چیختے ہوئے
کہا۔ "ان کے ہاں لڑکی ہی پیدا ہوگی۔ اگر لڑکا پیدا ہو تو میں آپ سب
صاحبان کے سامنے اپنی یہ بڑی بڑی مونچھیں خوشی خوشی نائی سے منڈوا دوں گا
اور آپ لوگوں کے دستخط کروا کر ایک درخواست راشٹرپتی کی خدمت
بھیج دوں گا جس میں یہ سفارش کی جائے گی کہ ہمارے دوست کو بے
مثال بہادری (لڑکا پیدا کرنے کی) دکھلانے کے عوض بہادری کا سب سے بڑا
اعزاز "پرم ویر چکر" عنایت فرمایا جاوے۔

"آمین" لڑکے کے امیدواروں میں سے ایک چلایا۔ جس پر کیا
تھا۔ لڑکی کے حامیوں نے بھی جوابی نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ "ہرگز
نہیں لڑکی ہی ہوگی"۔

"لڑکا ہی ہوگا"۔ لڑکے کے حواریوں کی محبت اور بھی جوش کھانے لگی
ہوگی۔

"لڑکی ہی ہوگی"۔ مخالفین نے غراتے ہوئے کہا۔

"لڑکا ہی ہوگا"۔ دوسری طرف والے چنگھاڑتے ہوئے بولے۔

"لڑکی زندہ باد"۔ لڑکی والوں نے نعرہ لگایا۔

لڑکا پائندہ باد لڑکے والے جوابی نعرہ لگاتے ہوئے۔

"لڑکی زندہ باد"

"لڑکا پائندہ باد"

آخر یہ نعرہ بازی رنگ لائی۔ جو بحث پہلے گالی گلوچ میں بدلی تھی اب ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ مخالفین ڈھول، چپت سے ایک دوسرے کی خاطر تواضع کرنے لگے۔ ہم نے سوچ کر کہیں ہمارا محلہ دوسرا جنگ منہ بن جائے جھٹ پولیس کو اطلاع بھجوا دی۔ تھوڑی دیر بعد پولیس کی ایک پوری گارد معہ ایس۔ پی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحبان موقعہ پر پہنچ گئی۔ لوگوں کو فوراً منتشر ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ چند ڈرپوک اشخاص تو وہاں سے کھسک گئے۔ مگر باقی ماندہ وہیں پر ڈٹے رہے اور برابر جوشیلے نعرے لگاتے رہے۔ آخر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تنگ آ کر لاٹھی چارج اور گیس چھوڑنے کا حکم دیا۔ چند منٹوں کے بعد کافی سے زیادہ لوگ تتر بتر ہو گئے۔ مگر چند ایک دھن کے پکے رہے آنکھیں بند کئے ہوئے "لڑکے" اور "لڑکی" کے حق میں نعرے لگاتے رہے۔ آخر پولیس ان کو امنِ عامہ میں خلل ڈالنے کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئی۔ مگر داد دینی چاہیئے ان لوگوں کے ایمان کی وہ پولیس چوکی کے ستیہ گرہیوں کی طرح بدستور لڑکے اور لڑکی کے نعرے لگاتے رہے +

تعارف

(اپنی قوم کے چند ایک اہم کرداروں سے)

ان سے ملیئے ...... آپ ہیں ہمارے وزیر آبادکاری
شری ٹرخاؤ لال جی۔ چونکہ وزیر صاحب کو ادگھاٹنوں، دوروں، سفارتی جوڑ توڑ
پارٹی پالیٹکس اور حکومت کا پراپیگنڈا کرنے سے فرصت نہیں ملتی اس لئے
ان کا کام تو صحیح معنی میں ان کے سیکرٹری ہی کرتے ہیں۔ دوسرے وزیروں کی
طرح شری ٹرخاؤ لال صاحب کا حافظہ بھی کمزور ہو گیا ہے۔ انہیں جنتا سے کئے
ہوئے وعدے یاد نہیں رہتے۔ ملک کی آزادی اور الیکشن سے پہلے یہ
لوگ لمبے لمبے چوڑے وعدے کرتے تھے کہ انہیں سن کر ہی ٹھیک آمی

طرح جھوم اُٹھتا تھا جیسے کسی مشاعرے میں چند ایک اچھے اشعار کو سن کر۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے یہ لوگ گدیاں سنبھالنے کے بعد ہندوستان کو اگر جنت نہیں تو کم از کم جنت نما ضرور بنا دیں گے۔ ہر شخص کو روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کریں گے۔ اگر کوئی شخص روٹی نہیں کھانا چاہے گا تو یہ زبردستی اس کے منہ میں پراٹھے ٹھونس دیں گے۔ اگر کوئی جان بوجھ کر بھی ننگا رہنا چاہے گا تو یہ پانچ سات تھان کپڑے کے لے کر اس کی طرف پھینکیں گے اور اگر کوئی شخص مکان میں گھسنے کر ہی دم لیں گے۔ لیکن جو کچھ ہوا اس کا ذکر کر کے ہم خود شرمندہ نہیں ہونا چاہتے۔ اگرچہ وزیر صاحب نے تو شرم بیچ کھائی ہے۔ اگر یہ شرم پروف نہ ہوتے تو چیونٹی کی طرح وزارت کی شکر سے نہ چمٹے... رہتے..

یہ ہیں روزنامہ اخبار "خبرستان" کے ایڈیٹر شری ایم - ایچ پرانچیا۔ معمولی سے معمولی خبروں کو بڑھا چڑھا کر سنسنی خیز انداز میں پیش کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا قلم کسی شخصیت یا پارٹی کی ہجو لکھتے لکھتے اچانک ہی اس کی شان میں قصیدے اگلنا شروع کر دیتا ہے۔ عام ان کے وسیلے میں یہ اتنا مانا شبہ ملتا ہے۔ جانتے ہیں کہ انہیں کوئی الہام ہوتا ہے ؟ جی نہیں .... بلکہ پُراسرار "ڈالر" کی غیبی طاقت ان کی تحریر کی طوفانی رخ کا تعین کر دیتی ہے۔ !

ان کے اداریے پڑھ کر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نو آموز افسانہ نویس نے کوئی کہانی لکھنے کی لنگڑی سی کوشش کی ہو۔ ان کے اخبار میں صرف چند خبریں کام کی اور نئی ہوتی ہیں۔ باقی سب خبریں چھپی خبروں کے الفاظ کو ادل بدل کر ناموں اور شہروں کے مناسب ہیر پھیر کو مدنظر رکھتے ہوئے دوبارہ شائع کر دی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو ایک ہی خبر ایک ہی ایڈیشن میں اور ایک جیسے الفاظ میں دو مختلف صفحوں پر آپ کے ذوق اخبار نویسی کی داد دیتے ہوئے نظر آ جاتی ہے۔ چھپائی کی غلطیاں تو آپ کے اخبار کا خاصہ ہیں۔ پہلے دفعہ آپ کے اخبار میں ایک نئے بیاہے ہوئے جوڑے کی تصویر کے نیچے یہ الفاظ چھپے ہوئے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ لکھا تھا مسز راجپال کی شادی میرٹھ کے مشہور ڈاکو جگن ناتھ کی سپتری نرملا سے ہوئی۔ یہ سوچ کر میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کہ آج کل مشہور ڈاکوؤں کی لڑکیاں بھی اپنی شادی کا فوٹو اخبار میں کس جرأت کے ساتھ چھپوا دیتی ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ انہیں ڈاکو کی بیٹی لکھوانے میں کوئی عذر نہیں۔ مگر دوسرے روز جب ایڈیٹر صاحب نے لمبی چوڑی معذرت طلب کرتے ہوئے ان الفاظ کی تصحیح شائع کی تو تمام معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔ بات یہ تھی کہ آپ کے کاتب نے غلطی سے مشہور ڈاکٹر کے الفاظ کی بجائے مشہور ڈاکو لکھ دیا تھا۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

آپ ہیں ایگزیکٹو انجینئر شری پی۔ ٹی یوحنا والا۔ انہیں یہ مت پوچھیے
کہ ٹھیکیداروں کی مختلف نہروں کو چالو کرتے ہی جب پانی چھوڑا جاتا ہے
تو جگہ بجگہ سائفن کیوں ٹوٹ جاتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ ان کی تعمیر کے
وقت بجری اور سیمنٹ کی بجائے ریت اور مٹی کا دل کھول کر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور
باقی ماندہ مٹی گورنمنٹ کی آنکھوں میں بھی جھونک دی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے
تو کیا اسے آپ کی انجینئری کے کمال کا ایک نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ اگر آپ کوئی روڈ یا سڑک
بناتے ہیں تو ایک آدھ برسات کے بعد وہ دلدل کی شکل میں کیسے تبدیل ہو جاتی ہے
کیا اسے بھی آپ کے فن کی شعبدہ بازی سمجھا جائے؟ ....

....
انہیں یہ بھی مت پوچھیے کہ اپنی نوکری کے دس یا چار پانچ سال کی
قلیل مدت میں آپ کم از کم ایک عالیشان کوٹھی کیسے بنوا لیتے ہیں حالانکہ اگر آپ بھی
شاہی خرچ کے بعد اپنی تنخواہ سے پیسے بچائیں تو اتنے عرصہ میں کوٹھی تو کیا ایک جھونپڑا
معمولی کوٹھا بھی کھڑا نہیں کر سکتے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ آپ کی رہائشی کوٹھی کی بنیادیں
اتنی مضبوط بنی ہیں کہ چالیس پچاس برس رہیں تو کیا اگر [illegible]
سیلابی پانی اس کی طرف چھوڑ دیا جائے تو اس کی ایک اینٹ تک نہیں ہل سکتی جہاں
نہر کے سائفن کہاں آپ کی کوٹھی کی بنیادیں!!

اور آپ ہیں ڈاکٹر وشنو داس لائٹے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ مریض آپ کو
مسیحا سمجھنے کی بجائے ملک الموت سمجھتے ہیں۔ بہرحال یہ خیال ان کا غلط ہے حقیقت سے

قریب ہے بیماری مریض کے جسم کو ہلکا کر دیتی ہے۔ اور آپ ایسے ڈاکٹر اس کی جیب کو اس طرح بیچارہ مریض اگر انتہائی خوش قسمتی سے جسمانی طور پر ٹھیک بھی ہو جاتا ہے تو روحانی طور پر دلگیر المریض بن جاتا ہے۔ حضرت سیدنا مسیح نے فرمایا ہے " اے خدا مجھے ہر قسم کی مصیبت میں ڈال دینا لیکن امتحان کی مصیبت میں میرے دشمن کو بھی نہ ڈالنا "۔ مگر آج کل کے ایک مشہور آدمی کا کہنا ہے " میرے خدا۔ مجھے ہر قسم کی مصیبت میں ڈال دینا لیکن ڈاکٹروں کے چنگل میں میرے دشمن کو بھی نہ ڈالنا "

خداداد دیکھنا۔ وہ سامنے کون آ رہے ہیں۔ جی ہاں ....

وہ۔ بڑی بڑی مونچھوں والے موٹے صاحب۔ کیا کہا؟ کوئی تھانیدار معلوم پڑتے ہیں۔ جی ہاں۔ بالکل ٹھیک۔ آپ کا خیال صحیح ہے [illegible] درست ہے۔ ان کا نام ہے بخشی فرنیل سنگھ۔ ابھی تھانیدار بنے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے لیکن تھوڑے عرصے میں ہی غضب اب ڈھا دیا ہے اور اس قسم کے تھانیداروں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں جب کسی واقعہ کی تفتیش کے سلسلہ میں کسی کے گھر جاتے ہیں تو اس کے دامن کی طرح جیب کے پانی اندر رہتی ہی سے خاطر تواضع کروانا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ بات بات میں گندی گندی گالیاں نکالنا تو آپ کا محکمانہ حق ہے۔ رشوت تو آپ لیتے ہی نہیں البتہ " نذرانہ " ضرور قبول کر لیتے ہیں۔ تھوڑے دن ہوئے کہ محکمہ اینٹی کرپشن ڈیپارٹمنٹ کے ایک [illegible] نے آپ کے خلاف رشوت ستانی کے سلسلے میں رپورٹ درج کروائی تھی۔

رپورٹ پیش ہونے کی دیر تھی کہ آپ کا نمونہ آئرش تھیں جو نکٹری کا سمد بیٹوں کی طرح دیکھ کر دس منٹ کی حالت میں تخصیص کا علم ہوا تب یہ جگہ بیس منٹ کا وقت ظاہر کرنے لگ گئی تھیں اور آپ کی کلفت لگی ہوئی پگڑی کا ..... طرہ لٹکتے لٹکتے رہنے کا زاویہ خانے کی بجائے مستورات سے پر آ گیا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کہ ایک ہفتے کے اندر اندر بھی آپ نے کون سا تیر مارا کہ آپ کے خلاف دائر کردہ رپورٹ ٹھیک ٹھیک ثبوت نہ ملنے کے باعث واپس لے لی گئی۔ اس واقعہ کے بعد آپ پہلے سے بھی زیادہ بہادر مطلق ہیں اور آپ کی مونچھیں اسی طرح واپس پہنچ گئیں جیسے بلند بالا ہمالیہ سے وہ ایک ہفتہ پہلے ہوا کرتی تھیں!

آداب عرض ہے صاحب ... سے جن آپ کا تعارف کروانے لگا ہوں ان کا نام ہے پریتم دیال چوہان۔ یہ صاحب ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہیں آگے کو ہو کر لوگوں کو چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے معشوق کی گلی کی طرح بار بار آپ کے دفتر کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔ وہ پردہ آپ کے کمرے کے باہر اپنے دریافت کردہ امور کے جواب میں بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہیں۔ مگر آپ یہ کیا کہ انہیں سوالات کا جواب دینے کی بجائے آپ کبھی رفیق کار سے اپنے گرد و پیش میں بیٹھنے والی لڑکی سے رومان کے متعلق یا کسی تھیٹر یا سینما کی فلم کی ہیروئن کے متعلق اخلاق سوز گپیں ہانکتے رہتے ہیں۔ یا پھر قلم کو ہاتھ میں لے کر اپنے رجسٹر کے کسی صفحے پر ... اس طرح مصروفیت ظاہر کرتے ہیں جیسے کوئی بہت بڑا آرٹسٹ ... ہو ... آرٹ کی دنیا میں ...

گیا ہو۔ ایسے میں آپ کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے لوگوں کے سوالات کی طرف ذرا دھیان نہیں دیتے۔ سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ جب کوئی دل جلا بار بار اونچی بول کر آپ سے پھر کچھ دریافت کرتا ہے تو آپ جلال میں آ کر اُسے اتنے غصے سے جواب دیتے ہیں گویا کہ اس نے آپ کی سمادھی بھنگ کر دی ہو۔ آج کل آپ کی بالکل ٹکٹ دے کر وزن بتلانے والی مشین کی طرح ہو چکی ہے۔ جس طرح ہم اس میں اکنی ڈال کر اپنا وزن معلوم کر سکتے ہیں ٹھیک اسی طرح آپ کی ہتھیلی میں چند سکے ڈال کر ہم اپنے کام کی بابت جان سکتے ہیں کہ ہمارا کام کب اور کس طریقے سے ہو گا +

اور آپ ہیں سیٹھ کھیم چند ذخیرہ بازی کرنے والا۔ آپ ایک بہت بڑے جنرل سٹور کے اکلوتے مالک ہیں۔ ان کے سٹور کے کئی ڈیپارٹمنٹ ہیں سیٹھ صاحب کریم پاؤڈر اور دوائیوں سے لے کر گرم مصالحوں۔ ہلدی نمک مرچ تک ہر چیز میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ اگر کوئی غریب ہندوستانی آپ کی ملاوٹ آمیز اشیا کھا کر بیماریوں میں مبتلا ہو کر قریب المرگ ہو جائے اور خدانخواستہ خودکشی کرنے کے لیے سیٹھ صاحب کے سٹور میں زہر لینے کو جائے بیچارے کا چھٹکارا نہ ہو سکے گا کیونکہ ہیں جناب کی مہربانی سے خالص زہر ملنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ اس پر آپ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ملاوٹ کے علاوہ آپ تول میں بھی چیزیں کم دیتے ہیں۔ کم تولنے سے شاید آپ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پوری چھٹانک تول لے تو بچارے کو خواہ مخواہ

زیادہ وزن اٹھانا پڑے گا کیوں نا امر کی جیب ہلکی کرنے کے ساتھ ساتھ
اس کے ہاتھ فروخت شدہ اشیا کا وزن بھی ہلکا کر دیا جائے۔ سیٹھ صاحب
گاہک کی خوب سیوا کرتے ہیں خدا آپ کو اس سیوا کا میوہ ضرور دے گا شاید
اس سے پہلے کوئی مجسٹریٹ ہی دے دے!

بہ سلسلہ شری ستیہ پال آنند جی - اے ایل - ایل بی - ایڈووکیٹ - یہ صاحب
فرماتے نہیں تھکتے کہ دراصل وکالت کا دوسرا نام جھوٹ کیوں پڑ گیا ہے۔ لوگ یہ
کیوں کہتے ہیں کہ کوئی شخص تب تک شاد کام نہ ہوگا اترا ہوا چیتھڑوں کا گرد گھنٹال اور جلد
سو بیس ساکھ والے وکلا کو جھوٹ کو اپنی لفظی ہیرا پھیری سے سچ
ثابت کر سکتے ہیں۔ کورٹ میرا الزام نہ ہے کسی شعبہ سے بار بار دکھلائے
جب وہ اس ستیہ پال آنند جی کا تذکرہ ہیں ان الفاظ کی جھنک پڑ جائے۔ نہ جانے
کچہریوں کے صبر کا ستے دار کبھی کبھی آسمان پہ لگنے والی صدا کی سپریم
کورٹ کا خیال کیا کریں۔ جب تک سچائی سے پیارے اس کو وکالت
صالحہ میں پیش ہوں گے۔ کہ سے موقعہ کا حسن آپ کے سامنے لائیں گے
نوازی وقت آپ کی کیا حالت ہو گئی۔ کیا حق شناسی ہی دوں کو زر مہاراج دیجیے
دے کر حسن کی تحصیل میں گریز نہ ہو سکے گا۔
تکمیل کیا جناب ہم اگر کچھ عیب پر شک جرأت کا دعویٰ کرتے تو ذات
کی مسیحائیت ہے!

لیجیے اب آ گئے ہم۔ آپ کی ملاقات ایک ہونہار طالب علم فخری زومیش سے۔ کلکتہ سے کرواتے ہیں۔ زومیش صاحب کا دھیان اپنی کتابوں کو بھلا کے فلموں کی طرف زیادہ رہتا ہے۔ اپنی جماعت میں پروفیسروں کے دیئے ہوئے لیکچر تو آپ کو یاد نہیں رہتے لیکن ہر ایکٹر اور ایکٹریس کی رہائش گاہ کا پورا پتہ مع اُن کی تاریخ پیدائش کے زبانی یاد رہتا ہے۔ آپ کو یہ تو پتہ نہیں رہتا کہ پانی پت کی پہلی لڑائی کون سے سن میں ہوئی اور کس نے جیتی لیکن یہ نہیں بھولتا کہ بینا رائے کی پہلی فلم "کالی گھٹا" تھی اور اُسے کشور ساہو نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ آپ کو یہ تو بھول جاتا ہے کہ مغلوں کے زمانہ میں ہندوستانیوں کا لباس کیسا ہوتا تھا لیکن یہ یاد رہتا ہے کہ دلیپ کمار نے فلم "شبنم" میں فلاں کٹ کی بش شرٹ پہنی ہوئی تھی اور راج کپور نے فلم "آوارہ" میں اس طرح کی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ آپ کو یہ خیال نہیں رہتا کہ پہلی پانچ سالہ یوجنا پر کتنا روپیہ خرچ ہوا ہے۔ لیکن یہ خیال ضرور رہتا ہے کہ مدھو بالا نے فلاں فلم میں کام کرنے کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ لیا تھا۔ زومیش صاحب۔ کیا آپ کو گھر والے پڑھنے کے لئے روپیہ دیتے ہیں یا سنیما۔ سگرٹ اور [illegible] کے لیئے۔ ٹھیک اب آپ لڑکیوں سے بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں مطلب یہ کہ آپ لڑکیوں کے ڈیزائن والے کپڑوں کو پہنتے ہیں۔ اس لئے بعض اوقات تو دور سے دیکھنے پر یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ آپ لڑکے ہیں یا لڑکی ؟

ہماری فلمیں!

ہندوستانی فلمیں دیکھ دیکھ کر میں ادھموا ہو گیا ہوں۔ کچھ دنوں سے یہ حال ہے کہ جب روزمرہ کے کاموں سے تھک کر میں اپنی اکتاہٹ دور کرنے کے لئے پکچر دیکھنے جاتا ہوں تو وہاں سے تفریح حاصل کرنے کی بجائے الٹا ڈھائی من گرد کا بوجھ لے کر باہر نکلتا ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ فلم کے کسی دردناک منظر کو دیکھ کر میرا یہ حال ہوتا ہے لیکن انہیں کیا معلوم کہ میری یہ حالت کسی المیہ منظر کو دیکھنے کی بجائے ہندوستانی پروڈیوسروں کی عقل کا ماتم کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہماری فلمیں بھی خوب ہیں۔ اگر کسی مزاحیہ فلم کو دیکھنے کے

سکتے جبھی تو سنیما ہال سے روتے ہوئے باہر نکلتے ہیں اور اگر کوئی المیہ فلم دیکھتے ہیں تو ہماری
ہنستے ہو سکے بڑا پیار اور پسماندگی کے بہلاوے کر اٹھتے ہیں۔ کامیڈی میں تو مسخرے اداکاروں کی
فضول اچھل کود اور غلط حرکات کو دیکھ کر بے تحاشہ رونا آ جاتا ہے اور ٹریجیڈی دیکھ
کر بیچارے ہیرو کی بے سروپا چیخ و پکار موقع بے موقع فریاد اور آہ و زاری ہمیں خواہ
مخواہ قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ صرف چند ایک ہیرو اور ہیروئنوں کو چھوڑ
کر باقی سب اداکار جب اور جو حرکات سے جذبات کی عکاسی اتنے بھونڈے
اور مضحکہ خیز انداز سے کرتے ہیں۔ بلکہ ہمارے دل میں اداکاری کی تعریف کے بجائے
الٹی نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فلمیں تفریح تو کم
دیتی ہیں اور وحشت زیادہ۔ ایسی ہی صورت حال کو پیش نظر رکھ کر میں اکثر اوقات
فیصلہ کرتا ہوں کہ ہندوستانی فلموں کا مکمل بائیکاٹ کر دونگا چاہے کوئی مجھے
گھسیٹ کر بھی سنیما ہال میں لے جانے کی کوشش کرے تو بھی نہ جاؤنگا۔ مگر
میرا یہ فیصلہ اکثر ہندوستانی وزیروں کے وعدوں کی طرح ہمیشہ ادھورا ہی رہ جاتا
ہے لوگ تو کہتے ہیں کہ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا مگر میں یہ کہتا ہوں کہ فلموں
کا کتا نہ گھر کا نہ سنیما کا۔ بیچارہ فلموں کا شوقین گھر پر بھی نہیں رہ سکتا اگر وہ
سنیما بھی نہیں جاتا۔ کیونکہ اچھی فلموں کا خوف کہ کہیں اچھی فلمیں تو ہاتھ سے نکل
جائیں اس طرح غائب ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ ایماندارانہ قابل دید فلمیں
موجودہ دور میں ہندوستان کی سطح زمین پر کہیں دکھائی نہیں دیتیں ہاں اگر
حکومت اشارہ کرے کہ پرانی فلمیں دکھا سکتے ہیں تو ہم جیسے
بچہ سالی جو ہوئی لنگڑی تو ہم بھی دیکھا ہو۔ مگر ان میں صرف دو چار ہی قابل ذکر

ہوتی ہیں۔ جوں جوں ہمارے فلمساز اپنی فلموں پر زیادہ سے زیادہ روپے
صرف کر رہے ہیں تیوں تیوں اُن کا معیار (اگر آپ کی نظر میں کوئی ہو!) اس تیزی
سے گر رہا ہے جیسے پہاڑی مقامات پر برف باری کے بعد ٹمپریچر۔
فلمی نقادوں کے خیال کے مطابق اگر وہ غلط نہیں کہتے تو
کسی فلم کی کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ اس کی کہانی مؤثر اور دل میں اُتر جانے
والی ہو ہدایت کار ٹھیک ٹھیک ڈرامائی تاثرات کو ابھارنے میں مدد دے تاکہ جن لطیف
جذبات کا اظہار الفاظ کے ذریعے ٹھیک طرح نہ کیا جا سکے انہیں دلنشیں حرکات
اور معنی خیز اشاروں ([illegible]) کے ذریعے بیان کیا جائے اس کے بعد موسیقی
ایسی ہونی چاہیے کہ اگر ایک اندھا شخص بھی فلم دیکھنے جائے تو پس منظر کی موسیقی
اور گانوں کو سن کر ہی فلم کی کہانی کو سمجھ لے فوٹوگرافی ایسی ہونی چاہیے جو مختلف
زاویوں سے فلم کے تمام کرداروں کے لطیف ترین جذبات اور احساسات
کے اتار چڑھاؤ کو اُن کے چہرے اور جسم کے دیگر اعضا کی حرکات کی صورت
عکاسی کر کے واضح انداز میں ہمارے سامنے پیش کریگی۔ لیکن ہوتا یہ ہے
کہ ہماری فلمیں ان سب چیزوں کو چھوڑ کر باقی ہر لحاظ سے مکمل ہوتی ہیں!
کہانی کو تو ہمارے ذہین فلمساز شاید بالکل ہی فضول چیز سمجھتے ہیں وہی گھسا
پٹا محبت کی فرسودہ کہانیوں کو ہی بار بار پیش کر کے ہمارے ذوق لطیف کی کند تشدد
سے چیر پھاڑ کرتے رہتے ہیں وہ محبت کی ازلی مثلث یعنی ایک لڑکا اور دو
لڑکیاں یا ایک لڑکی اور دو لڑکے بار بار پیش کر دیا جاتا ہے ان سے کہیں ہٹ کر
چرانے رہتے ہیں مگر کاش ہمارے فلمساز محبت کی اس ازلی مثلث کو

پیش کرنے کی بجائے کچھ نئی چیزیں سامنے لائیں۔ تخیل کی کوئی نئی راہیں دریافت کریں وقت کے نئے نئے منظر سے روشناس کرائیں اور اس بدلتی ہوئی زندگی کے نئے نئے پہلوؤں کو اجاگر کریں۔ اگر وہ کچھ اور نہیں کر سکتے تو ایک لڑکے اور دس لڑکیوں کے درمیان یا ایک لڑکی اور اس کے ڈیڑھ درجن عاشقوں کے درمیان محبت جیسی کوئی کہانی پیش کر کے اس محبت کی ازلی شدت سے توقعات دلاتے ہیں۔

اب لیجئے ہدایت کاری کو۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے نوے فیصدی ہدایت کاروں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہدایت کاری ہے کس چڑیا کا نام۔ ثبوت کے طور پر سینکڑوں ایسی فلمیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں ہمارے نام نہاد ہدایت کار اپنے ذہنی دیوالیہ پن کا مکمل ثبوت دے چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک فلم میں دیوالی کی رات کو پورا چاند نہایت ہی آب و تاب سے چمکتے ہوئے دکھایا گیا ایک اور فلم جو کہ مہاتما بدھ کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے ایک منظر میں ٹیلیفون کی تاروں کا کھمبا بھی دکھا دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں اس فلم کے ذہین ڈائرکٹر کا ٹیلیفون کے کھمبے کو دکھانے سے اشارہ یہ تھا کہ شاید شری رام چندر جی ٹیلیفون پر باتیں کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ڈھائی ہزار برس پہلے کے زمانے کی ترجمانی کرنے والی ایک اور فلم میں ہیرو کی کلائی پر اس کے نام کے پہلے حروف انگریزی الفاظ میں کھدے ہوئے دیکھے جا سکتے تھے۔ اس سے ظاہر

ہوتا ہے کہ اگر یہ اس زمانے میں ہندوستان آچکے تھے ۔ یہ تو ہمارے
عالم فاضل ہندوستانی ڈائرکٹروں کی بصیرت افروز اور کراماتی ہدایت
کاری کی چند گھٹیا مثالیں ہیں ۔ اگر ان کے تمام کرشموں کی پوری فہرست
بنائی ہو تو شاید اس کی لمبائی کئی میل ہو جائے ۔
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے ۔ دھارمک اور تاریخی فلموں
میں تو اصلی واقعات کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر دیوتا لوگ
اور مشہور تاریخی ہستیاں ان فلموں میں اپنے اپنے کارناموں کو
دیکھ سکیں تو جھٹ مار مار کر ہدایت کاروں اور فلم سازوں کا سر گنجا کر
دیں ۔
اب سنیئے ذرا ہندوستانی فلموں کی موسیقی کو ۔ یہ
کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ آج کل ہر ایرا غیرا نتھو خیرا جو کہ [illegible]
یا کچھ اور طریقے سے بجا سکتا ہے اپنے آپ کو میوزک ڈائرکٹر
سے کم نہیں سمجھتا ۔ اس وجہ سے ہر نئی فلم میں طرح طرح کی
موسیقی سننے میں آتی ہے ۔ اگر زمین پر سے ایک اینٹ اٹھا دو
تو اس کے نیچے سے کم از کم چار پانچ تان سین اللہ اللہ کر کے
[illegible] پھدکتے ہوئے باہر نکلتے ۔ ایک فلم میں گانے
تو ہوتے پھر .... کرداروں کے
جذبات کی شدت کی ترجمانی اور کہانی کے تاثرات کو ابھارنے
کے لئے تاکہ اس کی رفتار میں توازن اور ہم آہنگی قائم رہ سکے

مگر ہمارے میوزک ڈائرکٹر اور فلمساز گانوں کو موقع بے موقع اس طرح کہانی کے کئی حصوں میں ٹھونستے ہیں کہ بیچارا سو جگہ بجگہ لڑھک کر شکستہ بازیاں کھاتی ہوئی آخر میں چاروں شانے چت ہو جاتی ہے۔ اور ہماری فلم کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے نکلوا دیتی ہے۔ ہر فلم میں گانا ہیرو اور ہیروئن کا پیدائشی حق ہے اور انہیں اس پیدائشی حق سے دُنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بلا محروم نہیں کر سکتی۔ اُٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے۔ سوتے۔ جاگتے۔ روتے ہنستے اور ناچتے کودتے غرض ہر وقت آپ انہیں گاتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔

بعض اوقات تو وہ بیٹھے غلط موقعوں پر گاتے ہیں گو ہم بین کے جی میں آتا ہے کہ فوراً پردہ سکرین پر پہنچ کر ان کے منہ پر دو چار زنانے دار تھپڑ رسید کرے تاکہ انہیں موقع کی نزاکت کا احساس تو ہو جائے میرا ان سب باتوں کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ گانے ہماری فلموں میں ضرور ہونے چاہئیں لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا کہانی کے ماحول اور مقصد سے بنیادی تعلق ہونا چاہیے تاکہ وہ [illegible] اس میں جان ڈال سکیں۔ اس میں مشعل عمل ۔ [illegible] شکیلی ڈرامیٹور۔ اور طوفان

اور دریا کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔
خصوصاً فلم بازی کا گانا "دیکھو گجر کہا گیا ہے"۔
"سمے گزرتا جائے" محل کا "آئے گا آنے والا" "ٹیکسی ڈرائیور"
کا "اے میری زندگی" "پھر صبح ہوگی" کا "وہ صبح کبھی تو آئے گی!"
طوفان اور دیا کا "یہ کہانی ہے دیئے اور طوفان کی" وغیرہ
گانے اسی سلسلے کی روشن مثالیں ہیں۔
آئیے آپ ذرا کیمرہ مین کی مزاج پرسی کیجیے
تو یہ ہے آپ کا عکاس۔ دیکھیے کتنے دلکش منظر کا
فوٹو لینے کے لئے کتنی ڈھٹائی سے کیمرہ کو نزدیک لے
آیا ہے کیا اب یہ حسین منظر منظر ہی رہ جائے
گا؟
...... ہرگز نہیں۔ یہ تو یقیناً بنجر ہو کر رہ جائے
گا۔ اور دیکھیے کتنا جذباتی اور دردناک لمحہ ہے۔ ایک
بوڑھی ماں کو خبر مل رہی ہے کہ اس کا اکلوتا بیٹا جنگ میں
مارا گیا۔ اب ہمارے کیمرہ مین صاحب بجائے اس
کے کہ اپنا کیمرہ نزدیک لے جا کر اس خبر کے دردناک
تاثرات کو بوڑھی ماں کی درد و غم کی شدت سے
لبریز نمناک آنکھوں اور لرزتے ہوئے پھڑپھڑاتے ہونٹوں
سے دکھاتے تھوڑا دور ہی کھڑے رہ کر بوڑھی ماں کو سسکتے

ہوئے زمین پر گر رہے تھے تو بلاشبہ بہت ہی غیر خوش منظر کو رفیلم لینے پڑیں۔ شاید کمپنی مین صاحب کو دل کا دورہ پڑتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی ماں کی غمناک آنکھوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں کے تاثرات کو فلم [illegible] کے لئے اس کے نزدیک نہ جا سکے [illegible] یہ دردناک اور نازک حالت دیکھ کر کہیں ان کا اپنا دل نہ فیل ہو جائے لہٰذا چاہتا ہے کہ ایسے کیمرہ مین کو دھکے مار مار کر سٹوڈیو سے باہر نکال دیں اپنی پہلی فرصت میں اسے جوہو کے کنارے لے جا کر سمندر میں ایک "ناقابل پرواہ" کر دیویں تاکہ آئندہ اس قماش کے لوگ اپنے تخیل کی گندی چیزوں سے ایسے خوبصورت اور رقت انگیز مناظر کو ذبح نہ کر سکیں۔

ہماری فلموں میں ناچ بھی اتنے ہی ضروری ہیں جتنا کہ گانے۔ ہر فلم میں عموماً ایک درجن گانے اور آدھی درجن ناچ ہوتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہمارے ڈانس ڈائرکٹروں کا ناچ سے عشق کا نظریہ کلاسیکی ناچوں کے ماہروں کے نظریہ کے بالکل الٹ ہے ان کے خیال شریف میں ایک عورت کو بیلے ڈانس سے کولہے مٹکا کر جسم کو [illegible] انگڑائی کو [illegible] انداز [illegible]

حیا سوز ادائیں دکھلانے اور سینہ بنگم اچھل کود سے دوسرا نام ناچ
سے کبھی کبھی زوان کے ناچ کی نسبت سکول کے بچوں کی ڈھیل زیادہ
دل بہلانے والی ہوتی ہے۔

اب آپ ہی سمجھئے کہ یہ ہندوستانی فلمیں کس اچھا کیوں
تو کس لحاظ سے اگر ہندوستانی فلمسازوں کو ضرور ہی اپنی کسی خوبی
کا اعتراف کروانا چاہتے ہیں۔ تو وہ صرف یہ ہے کہ غیر ملکی فلموں
کی تکنیک اور کہانیاں چرانے میں انہیں کمال حاصل ہے!

اس کتاب کے تمام کردار مقامات اور ادارے فرضی ہیں۔ ان کا کسی شخص۔ واقعات یا ادارے سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی فرد۔ مقام یا ادارے سے مطابقت قطعی اتفاقیہ ہے۔ اس کے لئے مصنف یا پبلشرز پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی